معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ سو روپے — فی شمارہ دس روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو پچاس روپے (۲۵۰)

دیگر ممالک میں سالانہ — ہوائی ڈاک پچیس (۲۵) پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY , AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہئے اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵% ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۶۹ ماہ ربیع الاول ۱۴۲۳ھ مطابق ماہ جون ۲۰۰۲ء عدد ۶

فہرست مضامین

شذرات

اس وقت ملک کے حالات نہایت تشویش ناک اور بہت بدتر ہو گئے ہیں، اس سے ہر سنجیدہ، دردمند اور ذمہ دار شخص چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان، سخت متفکر اور پریشان ہے، وہ یہاں تک خیال کرنے لگا ہے کہ اگر یہی لیل و نہار رہے تو ملک کا کیا ہوگا، وہ کیسے تباہی سے بچے گا، ہماری جس نسل نے ملک کی آزادی کے لئے اپنی جانیں نچھاور کی تھی اور ہر طرح کی قربانیاں دی تھی، اس کے ختم ہونے کے بعد بدعنوانی، بے اصولی اور کرپشن کا جو سیلاب امنڈ پڑا ہے، اس کا چڑھاؤ برابر بڑھتا اور پھیلتا جارہا ہے، خود غرض حکمرانوں کو ملک سے زیادہ اپنا مفاد عزیز ہے، وہ اپنے ہوسِ اقتدار کی تسکین کے لئے ہر بے اصولی اور اور بدعنوانی کرنے کے لئے آمادہ رہتے ہیں، اس کی وجہ سے اخلاقی و معاشی بحران حدِ انتہا کو پہنچ گیا ہے، آئے دن گھٹالے اور گھپلے کے واقعات سامنے آرہے ہیں اور مہنگائی اور گرانی مسلسل بڑھ رہی ہے، ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے اور اس کی ساکھ خراب کرنے کے لئے یہی باتیں کیا کم تھیں کہ اب فرقہ واریت اور نفرت کا اژدھا پورے ملک کو نگل جانا چاہتا ہے، گجرات کا نہ ختم ہونے والا فساد تو ایک فرقہ کی نسل کشی ہی کے لئے کرایا گیا تھا، یہ منصوبہ چاہے پورا نہ ہو مگر ملک کو تاراج ضرور کردے گا۔

ملک میں تعصب، فرقہ پرستی، نفرت اور تشدد کی آگ اتنی شدت سے بھڑک اٹھی ہے کہ چمن میں ہر شخص پریشان ہے، ایک فرقہ دوسرے فرقے کے خون کا پیاسا ہے، پنڈت جواہر لال نہرو کے خیال میں "اکثریت کی فرقہ پرستی زیادہ خطرناک ہوتی ہے، یہ فسطائیت کا پیش خیمہ ہے" اسی کے بطن سے اقلیتوں میں خودکشی اور دہشت گردی کا رجحان پیدا ہوتا ہے جو ملک کے اتحاد و استحکام کو غارت کردیتا ہے، اکثریت کی اسی فرقہ وارانہ ذہنیت نے دو قومی نظریے کو جنم اور ملک کا بٹوارا کرایا تھا اور آج اسی ذہنیت کے لوگ اقتدار پر فائز رہنے کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کی دوری اور نفرت کو ختم نہیں ہونے دینا چاہتے ہیں، اکثریتی فرقے کی بعض خوں خوار اور جارحانہ تنظیموں پر کوئی قید و بندش نہیں لگا رہے ہیں، ان ہی کی وجہ سے اقلیتوں کا ایک طبقہ بھی غصہ اور جھنجھلاہٹ میں مرنے مٹنے کے لئے تیار ہو کر وہ سب کچھ کر رہا ہے، جس کی اجازت اس کے مذہب نے نہیں دی ہے، انہیں یہ سمجھنا چاہئے کہ جوش و اشتعال اور دہشت گردی سے مسائل حل نہیں ہوسکتے، ناگفتہ بہ حالات کے باوجود امن و سلامتی کا ماحول قائم رکھنا ان کی ذمہ داری ہے اور اکثریت کو اقلیت پر حملہ آور ہونے، ان کے جان و مال تباہ کرنے اور انہیں ان کے عقیدہ و مسلک سے برگشتہ کرنے کے بجائے ان کا دل جیتنے کی کوشش کرنی چاہئے، نفرت و عداوت کی خلیج پاٹنے اور اخوت و محبت کا

ماحول بنانے ہی میں ملک کی بھلائی اور ترقی ہے۔

اردو کشی کے موجودہ ماحول میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی "بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی" کے مانند ہے، یہ دراصل اردو کی ایک تعلیمی تحریک ہے جو ملک سے ناخواندگی دور کرنے میں بھی بڑی معاون ہوگی، یونیورسٹی کے ذمہ داروں نے چار برس کی مسلسل محنت شاقہ سے ایک ننھے پودے کو توانا اور سایہ دار درخت بنادیا ہے، یونیورسٹی اپنے کیمپس میں منتقل ہوچکی ہے، اس کے مین گیٹ "بابِ علم" کا سنگِ بنیاد رکھا جاچکا ہے، بڑی تعداد میں اکیڈمک اور غیر تدریسی عملے کا تقرر بھی ہوچکا ہے، اب اس نے پانچویں تعلیمی سال میں داخلے کا اعلان کیا ہے، اس سلسلہ میں وائس چانسلر نے اردو والوں سے اپیل کی ہے کہ وہ داخلے اور طلبہ کی تعداد میں نمایاں اور خاطر خواہ اضافے کو یقینی بنائیں، جن لوگوں کی مادری زبان اردو ہے اور جو اس کی محبت کا دم بھرتے ہیں، انہیں اردو کی اس تعلیمی تحریک اور یونیورسٹی کے داخلوں میں دوگنا اضافے کی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہئے، عربی مدارس کے طلبہ کے لئے یونیورسٹی نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔

یونیورسٹی کا گریجویشن پروگرام اچھی طرح چل نکلا ہے اور ہندوستان کے ہر گوشے میں اس کی کلاسز ہورہی ہیں، اسے اور فارغ التحصیل طلبہ کو آگے کی تعلیمی سہولت فراہم کرنے کے لئے تیزی سے اقدامات کئے جارہے ہیں، چند ماہ میں حکومت سے منظور شدہ پروفیسرس اور لکچررس کا عملہ یونیورسٹی سے منسلک اور پوسٹ گریجویٹ کورسز کے سلسلے کا آغاز ہوجائیگا جو زیادہ تر روزگار سے متعلق ہوگا۔ یونیورسٹی نے اپنے پانچویں تعلیمی سال کے آغاز پر فاصلاتی طریقہ تعلیم کے تحت آٹھ کورسوں میں داخلے کا اعلان کیا ہے جن میں تین سالہ ڈگری کورسز بی۔اے، بی۔کام اور بی۔ایس۔سی کے علاوہ پانچ چھ ماہی سرٹیفکٹ کورسز برائے غذا و تغذیہ، اہلیتِ اردو بذریعہ ہندی، اہلیتِ اردو بذریعہ انگریزی کمپیوٹنگ اور فنکشنل انگلش شامل ہیں، تمام کورسز میں راست داخلے کی آخری تاریخ ۵ر اکتوبر ہے، گریجویشن کورسوں میں بذریعہ اہلیتی ٹسٹ امیدواروں کے لئے اہلیتی ٹسٹ فارم جمع کرنے کی آخری تاریخ ۵ر جولائی ہے، ٹسٹ کا انعقاد ملک کے مختلف علاقوں میں تقریباً ۶۰ مقامات پر ۴ر اگست اتوار کو ہوگا، داخلے اور اہلیتی ٹسٹ کے فارم تمام اسٹڈی سنٹروں اور یونیورسٹی ہیڈ کوارٹرس سے مل سکتے ہیں، آج کل طلبہ میں تن آسانی اور سہل پسندی آگئی ہے، اور وہ آسان اور مختصر نصاب کی مانگ کرتے ہیں، ورنگل میں اردو یونیورسٹی کے فروغ میں ہونے والے ایک جلسے میں ان کو متنبہ کرتے ہوئے پروفیسر محمد شمیم جیراج پوری نے کہا کہ آج کے مسابقتی دور میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے سخت محنت اور زبردست لگن کے علاوہ اور کوئی دوسرا

راستہ نہیں ہے، یونیورسٹی طلبہ کو مختلف طرح کی آسانیاں فراہم کرتی ہے مگر آسانیوں کے نام پر یونیورسٹی اپنے معیار سے کبھی بھی سمجھوتہ نہیں کرے گی۔

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے نئے تعلیمی سال کے لئے قرض وظیفے جاری کرنے کے لئے ملک کے ان مسلم طلبہ و طالبات سے درخواستیں طلب کی ہیں جنہوں نے میٹرک کم از کم ۸۰ فیصد یا انٹر یا اس کا مساوی امتحان کم از کم ۷۵ فیصد یا گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کم از کم ۷۰ فیصد نمبروں سے پاس کیا ہو، جن طلبہ و طالبات کے نمبر اپنی اپنی ریاستوں میں سب سے زیادہ ہوں گے، صرف ان ہی کو ۱ اکتوبر ۲۰۰۲ء میں سوسائٹی کے خرچ پر انگریزی اور معلومات عامہ (جنرل نالج) کے امتحان اور انٹرویو کے لئے دہلی بلایا جائے گا، اس کے بعد ہی وظیفوں کا فیصلہ ہوگا جو میٹرک پاس کو ۲۵۰/ انٹر کو ۳۵۰/ گریجویٹ کو ۵۰۰/ اور پوسٹ گریجویٹ کو ریسرچ کے لئے ۱۲۰۰/ روپئے ماہانہ دیا جائے گا، وظائف کے حق دار یہ پابند ہو کردیں گے کہ تکمیلِ تعلیم کے زیادہ سے زیادہ دو سال کے بعد سے قرض وظیفہ کی رقم وہ ماہ بہ ماہ (اگر چاہیں تو ایک مشت بھی) ان ہی قسطوں میں واپس کرنا شروع کردیں گے جن قسطوں میں وہ ان کو ملی تھی، سالانہ جائزے میں وظیفہ یابوں کی تعلیمی رفتار اطمینان بخش ہونے ہی پر وظیفہ کی تجدید کی جائے گی، ۱۹۸۶ء سے اب تک مختلف ریاستوں کے ۳۵۸ مسلم طلبہ و طالبات اس اسکیم سے فائدہ اٹھا چکے ہیں، یہ اسکیم ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی دور کرنے کے لئے سوسائٹی کے سابق صدر حکیم عبدالحمید صاحب (موجودہ صدر جناب عبدالمعید صاحب) کے ایما پر جاری کی گئی تھی، وظائف پانے کے خواہش مند جن مسلم طلبہ و طالبات کا ارادہ ہو کہ وہ تعلیم کا سلسلہ عصری تعلیم کے کسی تسلیم شدہ ادارے میں کم از کم ۲۰۰۴۔۲۰۰۳ء کے تعلیمی سال تک جاری رکھیں گے وہ سکریٹری ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، تعلیم آباد، سنگم وہار، نئی دہلی کے نام خط بھیج کر درخواست فارم منگوا سکتے ہیں جو ۷/ستمبر ۲۰۰۲ء تک وصول کئے جائیں گے، اس کے بعد ملنے والی درخواستوں پر غور نہ ہوگا۔

۲۶/مئی ۲۰۰۲ء کو دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کی مجلس انتظامیہ کے ہونے والے جلسے میں اس کی مالی حالت بہتر بنانے کے لئے کئی تجویزیں پیش ہوئیں، ایک تجویز حیاتی رکن بنانے کی بھی پیش ہوئی تھی اس کا آغاز اعظم گڈھ میں کیا جاچکا ہے، اور دوسرے شہروں میں بھی اس مہم کو چلانے کا پروگرام ہے، امید ہے کہ اصحابِ خیر، دارالمصنفین اور علامہ شبلیؒ کے قدرداں اس کو کامیاب بنانے میں کارکنانِ دارالمصنفین کا پورا تعاون کریں گے، لائف ممبر حضرات کو ان کے دس ہزار عطیے کے عوض اسٹاک میں موجود دو ہزار کی کتابیں (جن کو وہ پسند کرتے ہیں) فوراً پیش کی جاتی ہیں اور آئندہ چھپنے والی کتابیں اور مجلہ معارف ان کو تاحیات پیش کیا جائے گا۔ یہ سودا ہم خرما و ہم ثواب کے مصداق ہے۔

مقالات

"تحریک نقطوی اور "دین الٰہی" پر اس کے اثرات"[1]

از ڈاکٹر محمد معتصم عباسی آزاد٭

ایران پر عربوں کے سیاسی تسلط اور دین اسلام کی اشاعت کے بعد یوں تو اس کے خلاف بہت سی سیاسی، مذہبی اور نیم مذہبی تحریکیں وجود میں آئیں لیکن حسن بن صباح کی "تحریک باطنیہ" کے بعد جن تحریکوں نے زیادہ زور پکڑا ان میں آٹھویں صدی ہجری/چودہویں صدی عیسوی کی تحریک حروفی اور نویں صدی ہجری/پندرہویں صدی عیسوی کی تحریک نقطوی بڑی اہم تحریکیں تھیں۔

"دین حروفی" کا بانی فضل اللہ استرآبادی تھا۔ اس نے تیمور لنگ کے دور حکومت میں اس دین کی بنیاد رکھی تھی۔ لیکن آٹھویں صدی ہجری کے اختتام کے ساتھ ہی یہ دین اور اس کے ماننے والے ختم ہوچکے تھے۔ البتہ "تحریک نقطوی" جس کا بانی فضل اللہ استرآبادی کا شاگرد محمود پسیخانی تھا۔ دو صدیوں سے زائد عرصہ تک ایران، ہندوستان اور ترکی پر اثرانداز رہا۔

---

[1] اس مضمون کی تیاری میں پروفیسر نذیر احمد کے مقالے "تحریک نقطوی پر ایک طائرانہ نظر" (تاریخی و ادبی مطالعے) اور پروفیسر محمد اسلم مرحوم (پاکستان) کی کتاب "دین الٰہی اور اس کا پس منظر" سے مدد لی گئی ہے۔

٭ جی۔۴/۳۔ سفینہ عباسی۔ میڈیکل کالج روڈ۔ علی گڑھ

محمود پسیخانی گیلان کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ اسے بچپن سے حصولِ تعلیم کا شوق تھا۔ اس زمانے میں فضل اللہ استرآبادی کے علم و فضل اور اس کے دین کا شہرہ تھا۔ محمود نے فضل اللہ استرآبادی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد استاد اور شاگرد میں ناچاقی ہوگئی۔ دونوں ایک دوسرے سے علٰحدہ ہوگئے۔

محمود اپنی ابتدائی زندگی میں نہایت متقی، پرہیزگار اور عبادت گذار تھا۔ علائقِ دنیوی سے دستکش ہوکر آبادی سے دور عبادت و مراقبہ میں مصروف رہتا تھا۔ درختوں کی پتیوں اور گھاس وغیرہ پر گذارا کرتا تھا۔ ایک روز وہ ندی کے کنارے وضو کر رہا تھا کہ اسے دور سے کوئی چیز بہتی ہوئی اپنی طرف آتی نظر آئی۔ قریب آنے پر اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا۔ دیکھا تو تازہ گاجر تھی۔ وہ اسے کھا گیا۔ روز اسی طرح وقت مقررہ پر گاجر بہتی ہوئی آتی تھی اور وہ اس کو پکڑ کر کھا لیا کرتا تھا۔ اس طرح دو ماہ کا عرصہ گذر گیا۔ ایک روز وہ وقت سے پہلے ندی پر پہنچ گیا۔ اچانک اس کے خیال میں آیا کہ دیکھنا چاہئے کہ یہ گاجر آخر آتی کہاں سے ہے۔ وہ ندی کے بہاؤ کے مخالف سمت چلنے لگا۔ تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ اسے دور ندی کے کنارے ایک برہنہ عورت نظر آئی جو گاجر کے ذریعہ ناشائستہ حرکت میں مصروف تھی۔ جب اس کی خواہش کو تسکین ہوگئی تو اس نے وہ گاجر ندی میں پھینک دیا[1]۔ محمود نے جب یہ منظر دیکھا تو اس نے خدا کو مخاطب کرکے کہا کہ اپنے مخلص بندوں کو ایسی چیز کھانے کو دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ الحاد و زندقہ میں پڑ گیا۔ عزلت نشینی ترک کرکے سیاحت کو نکل کھڑا ہوا۔ اس کا آغاز اس نے بیت المقدس سے کیا اور بیشتر

---

[1] مبلغ الرجال، مولانا عبیداللہ خواجہ کلاں، ورق ۳۲-۳۱ الف۔

"زردکی را در محل مخصوص فرومی فرستد و برمی آرد و ساعتی بدان عمل قیام کرد۔
چون از کار پرداخت و آتش توقانش فرونشست زردکی در آب از دست فروهشت۔"

روئے زمین کا سفر کر ڈالا۔ آخر کار استرآباد واپس آیا اور یہیں اس نے ۸۰۰ ہجری میں تحریک نقطوی کی بنیاد رکھی[1]۔

روایت کے مطابق محمود نے سولہ کتابیں اور جداگانہ عنوانات کے تحت ایک ہزار رسائل تصنیف کئے۔ ان میں سے چند ہی باقی رہ گئے ہیں جن کی تفصیل ایرانی محقق ڈاکٹر صادق کیا کی کتاب "نقطویان و پسیخانیان" کے حوالے سے استاد محترم پروفیسر نذیر احمد نے اپنے مقالہ "فرقہ نقطویان پر ایک طائرانہ نظر" میں دی ہے۔ بدایونی کا بیان ہے کہ ان میں "بحر و کوزہ" اتنا گندہ ہے کہ اس کو سُن کر کان کو قے آتی ہے[2]۔

ذیل میں اس تحریک کے بنیادی عقائد مختصراً بیان کئے جاتے ہیں[3]۔ تفصیل کے لئے پروفیسر نذیر احمد کا مقالہ "فرقہ نقطویان پر ایک طائرانہ نظر" اور پروفیسر محمد اسلم مرحوم (پاکستان) کی کتاب "دین الٰہی اور اس کا پس منظر" کا مطالعہ مفید ہوگا۔ جدید فارسی جاننے والے ڈاکٹر صادق کیا (ایران) کی کتاب "نقطویان و پسیخانیان" سے استفادہ کر سکتے ہیں:

---

[1] دیکھئے "تحریک نقطویان پر ایک طائرانہ نظر" پروفیسر نذیر احمد، تاریخی و ادبی مطالعے، ص ۲، نقطویان و پسیخانیان، ڈاکٹر صادق کیا ص ۵، اور "دین الٰہی اور اس کا پس منظر" ڈاکٹر محمد اسلم (پاکستان) ص ۱۰۔

[2] منتخب التواریخ، بدایونی، جلد ۲ ص ۲۴۷

"فضلاتی کہ در آنجا خوردہ گوش از شنیدنِ آن قی می کند۔"

[3] تفصیل کے لئے دیکھئے: تاریخی و ادبی مطالعے، پروفیسر نذیر احمد ص ۲، "دین الٰہی اور اس کا پس منظر"، ڈاکٹر محمد اسلم (پاکستان)، نقطویان و پسیخانیان، ڈاکٹر صادق کیا۔ دبستان مذاہب محسن فانی ص ۵۲-۵۱، مبلغ الرجال، مولانا عبیداللہ خواجہ کلاں، ورق الف ۲۔

۱۔ محمود پسیخانی کا عقیدہ تھا کہ ہر چیز کی تخلیق خاک سے ہوئی ہے۔ وہ آگ، ہوا، مٹی اور پانی کو نقطہ مانتا ہے۔

۲۔ وہ تناسخ کا قائل تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ ہر چیز کے ذرات ہر وقت موجود رہتے ہیں اور اپنی صورت بدلتے رہتے ہیں۔ ہر چیز مختلف وقتوں میں مٹی، پتھر، حیوان اور انسان کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ ہر چیز کی خو، بو سے اس کی پچھلی شکل کی تشخیص ہوسکتی ہے۔

۳۔ وہ کواکب کی تاثیر کا قائل تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ زمین میں جو کچھ ڈالو گے وہ کواکب و عناصر کی تاثیر سے خود بخود اُگ آئے گی۔ اس میں قدرت خداوندی کا کوئی دخل نہیں ہے۔

۴۔ اس کا عقیدہ تھا کہ عناصر میں جب قوت پیدا ہوتی ہے تو معدنی شکل نباتی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ پھر اس پر حیوانی قبا چست ہوتی ہے۔ جب اس میں شان و شوکت پیدا ہوتی ہے تو انسان کامل کے درجے کو پہنچ جاتا ہے۔ اس طرح آدم کے ظہور کے قبل سے لے کر اب تک انسانی اجزا ارتقائی مراحل طے کرتے رہے اور ان کا ہر قدم کمال کی طرف بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ "مرتبہ محمدیؐ" آگیا۔ جب یہ قدم کچھ اور آگے بڑھا تو "درجۂ محمودی" آیا۔

۵۔ وہ انسان کامل کو "مرکب المبین" کہتا تھا اور اس کی پرستش کا قائل تھا نقطوی اس کو "مرکب المبین" مانتے تھے۔

۶۔ اس نے قرآن مجید میں "کمثلہ شئی" کی جگہ "ان المرکبین" لکھ دیا تھا۔ اس نے قرآن مجید کی حیرت انگیز تفسیر بھی کی تھی۔

۷۔ وہ عقلیات کا قائل تھا اور نقلیات کا منکر تھا۔ خود کو عقلیات کا داعی کہتا تھا۔

۸۔ خدا، قیامت، دوزخ، بہشت، فرشتوں اور جزا و سزا کا قائل نہیں تھا۔

۹۔ نقطویوں کا کلمہ "لا الٰہ الا المرکبین" تھا۔

۱۰۔ نقطوی ملاقات کے موقع پر ایک دوسرے سے سلام مسنونہ کے بجائے اللہ اللہ کہتے تھے۔

۱۱۔ ان کی ایک خاص دعا تھی جو سورج کی طرف رُخ کر کے پڑھی جاتی تھی۔

۱۲۔ محمود پسیخانی کا قول تھا کہ اول ظہور سے محمود پسیخانی تک آٹھ ہزار سال کی مدت عربوں کی تھی۔ اب آٹھ ہزار سال کی مدت عجمیوں کی ہوگی۔ پیغمبران میں پیدا ہوں گے اسلام کا دور ختم ہوگیا[1]

رسید نوبت رندان عاقبت محمود — گذشت آنکہ عرب طعنہ بر عجم می زد

(عاقبت محمود رندوں کی باری آگئی۔ وہ وقت گذر گیا جب عرب عجم پر طعنہ زنی کیا کرتے تھے)

اس کا دعویٰ تھا کہ اسلام منسوخ ہوچکا۔ اس کا لایا ہوا دین برحق ہے اور اس کی بتائی ہوئی راہ سیدھی ہے۔ اس کو قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔[2]

از محمدؐ گریز در محمود — کاندراں کاست اندریں افزود

(محمد سے محمود کی طرف جاؤ۔ اس میں گھٹا اس میں بڑھا یعنی محمد میں وہ بڑھ کر محمود بنا)

۱۳۔ وہ قرآن مجید کو حضورؐ کی تصنیف مانتا تھا۔ شعائر اسلامی کو اجداد کا

[illegible]

وضع کردہ بتاتا تھا۔ نقطوی شعائر اسلامی کا مذاق اڑاتے تھے۔

اس تحریک نے ہندوستان، ایران اور ترکی میں ہزاروں لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کیا تھا، ایران میں تو اسے اتنا فروغ حاصل ہوا کہ صفوی حکومت معرض خطر میں پڑ گئی تھی۔ شاہ عباس صفوی کو ہزاروں کی تعداد میں نقطویوں کو موت کے گھاٹ اتروا دینا پڑا۔ جو بچ رہے وہ ہندوستان اور ترکی فرار ہوگئے تھے[1]

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں اکبر حکمراں تھا۔ شیخ مبارک اور اس کے دونوں بیٹے فیضی اور ابوالفضل دربار میں رسائی اور اکبر کے مزاج میں دخل پانے کے لئے مختلف حربے استعمال کر رہے تھے[2] چونکہ شیخ مبارک اور ابوالفضل کا شمار "مجتہدان مذہب نو"[3] میں کیا جاتا ہے اور "دین الٰہی" کے ستون مانے جاتے ہیں، لہذا "دین الٰہی" پر "تحریک نقطوی" کے اثرات کا جائزہ لینے سے قبل ان دونوں کی سیرت و کردار کے بارے میں جاننا ضروری ہو جاتا ہے تاکہ تاریخی حقائق کو واقعات کے صحیح پس منظر میں سمجھنے میں آسانی ہو۔

شیخ مبارک کے بارے میں مشہور ماہر ایرانیات ایڈورڈ جی۔ براؤن کا

---

[1] تاریخ عالم آرائی عباسی، اسکندر بیگ منشی، جلد ۲ ص ۳۲۵ "نقطویان و پسیخانیان" ڈاکٹر صادق کیا ص ۱-۹، منتخب جلد ۲ ص ۲۴۶ [2] بدایونی ان حربوں کے لئے "چراغ صباحیان" کی اصطلاح استعمال کرتا ہے، یعنی اسمٰعیلی حربے اس کا جملہ ہے: "آتشی در جہان انداختہ و چراغ صباحیان کہ چراغ گرفتن در روز روشن داشت روشی کرد" منتخب جلد ۲، ص ۱۵۸ [3] منتخب جلد ۲ ص ۲۰۳ پروفیسر محمد اسلم نے لکھا ہے کہ یہ اصطلاح بدایونی نے ابوالفضل کے لئے استعمال کی ہے لیکن چونکہ جمع ہے لہذا میرا خیال ہے کہ اس نے شیخ مبارک، ابوالفضل اور شریف آملی تینوں کے لئے استعمال

بیان ہے کہ بیشتر لوگ اسے شیعہ سمجھتے تھے[1] پروفیسر محمد اسلم بھی اسے زیدی شیعہ بتاتے ہیں[2] اس کے آبا و اجداد یمن کے باشندے تھے جو زیدی شیعوں کی قدیم آبادی تھی۔ اس کے مورث اعلیٰ یمن سے ہجرت کر کے سندھ کے قریب ریل نامی قصبہ میں آباد ہو گئے تھے جو ان دنوں اسمٰعیلی اور بوہرہ شیعوں کا تبلیغی مرکز تھا۔ شیخ مبارک کا باپ شیخ خضر ریل کی سکونت ترک کر کے ناگور میں بس گیا تھا۔ شیخ مبارک یہیں ۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء میں پیدا ہوا تھا۔ لودیوں کے دور میں جب مرکزی حکومت کمزور ہوئی اور راجپوتوں نے راجستھان کی مسلم آبادیوں پر حملہ شروع کیا تو شیخ مبارک ناگور سے احمد آباد منتقل ہو گیا۔ اس زمانے میں یہ شہر اسمٰعیلی شیعوں کی مذہبی سرگرمیوں کا مرکز تھا بڑے بڑے شیعہ علما یہاں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ شیخ مبارک نے یہیں مالکی، شافعی، حنفی، حنبلی اور امامیہ فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ فقہ جعفریہ کا مطالعہ کر کے خود کو مجتہد کے درجے پر پہنچایا۔ اس کے بعد اس نے تصوف کی طرف توجہ دی اور اشراقیت کی طرف مائل ہو گیا[3]

تصوف و اشراقیت کے مطالعہ کے بعد وہ فلسفہ کی طرف مائل ہوا اس زمانے میں جلال الدین دوانی (مصنف اخلاق جلالی) کے شاگرد ابوالفضل گازرونی احمد آباد میں فلسفہ کا درس دیا کرتے تھے۔ شیخ مبارک ان کے شاگردوں کے زمرے میں شامل ہو گیا اور ان سے کسب فیض کیا۔ فلسفہ پر عبور حاصل کر لینے کے بعد وہ دوبارہ تصوف کی طرف مائل ہوا۔ شیخ عمر تتنوی سے "طریقہ کبرویہ" کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد دوسرے مشائخ سے شطاریہ، طیفوریہ، چشتیہ، سہروردیہ سلسلوں کا درس لیا[4]

---

[1] لٹریری ہسٹری آف پرشیا، جلد ۴ ص ۱۸ [2] دین الٰہی اور اس کا پس منظر ص ۱۰ [3] آئین اکبری جلد ۳ ص ۲۳ [4] ایضاً۔

۲۹ سال عمر میں وہ آگرہ چلا گیا اور ایک مدرسہ میں درس وتدریس میں مشغول ہوگیا چونکہ اس کی طبیعت میں استقلال نہیں تھا اس لئے وہ کبھی ایک حالت پر مطمئن نہ رہ سکا۔ بدایونی کا بیان ہے کہ یہاں اس کی دوستی مہدوی فرقہ کے رہنما شیخ علائی سے ہوگئی اور اس نے مہدوی طریقہ اختیار کر لیا[۱]۔ جب مہدویوں پر شاہی عتاب نازل ہوا تو ہمدانیہ سلسلے سے منسلک ہوگیا اور خود کو درویش کامل ظاہر کرنے لگا[۲]۔ جب ہمایوں بادشاہ کی رشتہ داریاں نقشبندیوں میں ہوئیں تو نقشبندی مشائخ میں اٹھنے بیٹھنے لگا۔ اپنی بیٹی کی شادی بھی حضرت خواجہ باقی باللہ کے خلیفہ خواجہ حسام الدین سے کر دی تھی[۳]۔ شاہنواز خاں کا بیان ہے کہ اکبر کے عہد میں "کہنہ مومنان عراق" کی دربار میں آمد و رفت اور پذیرائی ہوئی تو شیخ مبارک بھی تقیہ کا لبادہ اتار کر اپنے اصلی رنگ میں آگیا[۴]۔

حضرت باقی باللہ کے صاحبزادے مولانا عبید اللہ معروف بہ خواجہ کلاں شیر خوارگی میں یتیم ہوگئے تھے۔ ان کی پرورش ان کے خلیفہ خواجہ حسام الدین نے کی تھی جن سے شیخ مبارک کی صاحبزادی منسوب تھیں۔ گویا خواجہ کلاں کی پرورش شیخ مبارک کی بیٹی کے گھر میں ہوئی تھی اور ان کی حیثیت خاندان کے فرد کی تھی۔ وہ شیخ مبارک کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ ہر زمانے میں اسی مذہب ومشرب کو اپنا شعار بنا لیتا تھا جس کی طرف اس زمانے کے بادشاہ وامراء کا میلان ہوتا تھا۔ چنانچہ ابراہیم لودی کے دور میں کٹر سنی تھا۔ سوریوں کے زمانے میں مہدوی، ہمایوں کے عہد میں نقشبندی اور اکبر کے زمانے میں

۱؎ منتخب، جلد ۲ ص ۱۹۸ ۲؎ مآثر الامراء، شاہنواز خاں، جلد ۲ ص ۵۸۹ ۳؎ آئین اکبری، جلد ۲ ص ۲۹۰ ۴؎ مآثر الامراء، جلد ۲ ص ۵۸۹۔

صلح کل کا علمبردار بن کر مشرب اباحت پہ گامزن ہوگیا[۱]۔

مسٹر ویلزلی ہیگ بھی اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ شیخ مبارک مختلف ادوار میں سنی، شیعہ، صوفی، مہدوی اور خدا جانے کیا کیا رہ چکا تھا[۲]۔

ابوالفضل اسی شیخ مبارک کا بیٹا تھا۔ اس نے تعلیم وتربیت بھی باپ ہی سے پائی تھی اور باپ ہی کے نقش قدم پر بڑی سعادت مندی کے ساتھ گامزن تھا۔ چونکہ شیخ مبارک کا کردار شروع ہی سے مشکوک تھا وہ دربار میں رسائی اور اکبر کے مزاج میں دخل پیدا کرنے کے لئے طرح طرح کے حربے اور حیلے استعمال کر رہا تھا۔ لہٰذا راسخ العقیدہ علماء کے ہاتھوں اسے اور اس کے اہل خاندان کو اذیتیں اٹھانی پڑتی تھیں جس کا فطری ردعمل یہ ہوا کہ ان علماء کی طرف سے ان کے دلوں میں کینہ پیدا ہوگیا۔ وہ اکبر کو ان کے اثرات سے نکالنے کے لئے مختلف تدابیر پر عمل پیرا تھے۔ ابوالفضل کو نہ صرف علماء سے پرخاش تھی بلکہ وہ اسلام کے بارے میں بھی تشکک میں مبتلا تھا اور الحاد کی طرف مائل تھا۔ اس نے بدایونی سے ایک بار اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا کہ چاہتا ہوں کچھ دنوں وادی الحاد کی سیر کروں۔ بیرون ملک اسلام دشمن عناصر سے اس کی خط وکتابت تھی۔ چنانچہ ایرانی محقق اسکندر منشی اس کی شہادت دیتا ہے کہ جب شاہ عباس صفوی کے حکم سے کاشان میں نقطوی تحریک کے پیشوا میر احمد کاشی کا گھر لوٹا گیا تو اس گھر سے ابوالفضل کے خطوط برآمد ہوئے تھے جس میں تحریک نقطوی سے دلچسپی اور میر احمد کاشی سے عقیدت کا اظہار تھا[۳]۔ اسکندر منشی کی یہ بھی شہادت ہے کہ

۱؎ مبلغ الرجال، ورق ۱۳۳ الف ۲؎ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد ۴ ص ۱۸ ۳؎ تاریخ عالم آرائی عباسی، جلد ۲ ص ۳۲۵۔

اس نے نقطوی مذہب اختیار کر لیا تھا اور اکبر کی گمراہی میں اس کا ہاتھ ہے[1]

"شیخ ابوالفضل ولد شیخ مبارک کہ از ارباب فضل و استعداد ولایت ہند و در ملازمت بادشاہ عالی جاہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ تقرب و اعتبار تمام یافتہ بود این مذہب داشت و بادشاہ را بکمالات داہیہ وسیع المشرب ساختہ از جادۂ شریعت منحرف ساختہ۔"

ترجمہ: (ابوالفضل ولد شیخ مبارک جو ولایت ہند کے ارباب فضل و استعداد میں ہے اور جسے بادشاہ عالیجاہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کا تقرب اور اعتماد حاصل ہے یہی مذہب رکھتا تھا۔ اس نے بادشاہ کو اپنے کمالات داہیہ سے وسیع المشرب بنا کر جادہ شریعت سے منحرف کر دیا۔)

خواجہ کلاں بھی اسے محمود پسیخانی کا پیرو بتاتے ہیں[2]۔ سر سید نے بھی "آئین اکبری" میں جہاں تشبیہی کاشی کا ذکر آیا ہے اس کے حاشیہ پر ابوالفضل کے بارے میں لکھا ہے کہ "از سر آغاز آگہی شوریدگی دارد و آئین محمودیان می زند"[3]۔ اس کے علاوہ نقطویوں سے اس کے جس طرح کے تعلقات تھے اس سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ نقطوی مذہب اختیار کر چکا تھا۔ خواجہ کلاں کا بیان ہے کہ نقطوی مبلغ شریف آملی ابوالفضل کا دست راست بن گیا تھا اور محمود پسیخانی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے "مراتب چہارگانہ" جو ابوالفضل کے اجتہاد کے نتائج تھے۔ ان کی تبلیغ کیا کرتا تھا[4]۔ وقوعی نیشاپوری اور تشبیہی کاشی کی ابوالفضل کے گھر آزادانہ آمد و رفت تھی[5]۔ تشبیہی کاشی کو ابوالفضل مجتہد تسلیم کرتا تھا[6]۔

[1] تاریخ عالم آرای عباسی، جلد ۲ ص ۳۲۵ [2] مبلغ الرجال ورق ۱۳۳ الف [3] آئین اکبری جلد ۳ ص ۲۱۵ (حاشیہ) [4] مبلغ الرجال ورق ۱۳۱ الف [5] منتخب، جلد ۲ ص ۳۵ [6] ایضاً ص ۲۰۵۔ ص ۲۰۴۔

"رقعات ابوالفضل" میں شریف آملی کے نام ابوالفضل کے گیارہ خطوط ہیں جن سے ان کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے علاوہ ابوالفضل نے اہل اسلام کے لئے اپنی تصنیفات میں جو حقارت آمیز القاب "منتسبان دین احمدی" "کوتاہ بین تقلید پرست" "پیروان کیش احمدی"، "سادہ لوحان تقلید پرست"، "گم گشتگان بیابان ضلالت"، "گرفتاران زندان تقلید" استعمال کیا ہے[1] وہی اس کے ملحد اور نقطوی ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔ وہ خود اس کا اعتراف کرتا ہے کہ اس پر کفر کے فتوے لگنا شروع ہو گئے تھے[2]۔

جن دنوں شیخ مبارک اپنی مظلومیت کی آڑ میں راسخ العقیدہ علمار کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں مصروف تھا اتفاق سے ایک ایسا واقعہ پیش آگیا جس کے لئے اگر یہ کہا جائے کہ اس نے ہندوستان کی تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا تو بے جا نہ ہوگا۔ متھرا کے ایک برہمن نے جو رانی جودھا بائی کا پروہت بھی تھا، مسجد کی تعمیر کے لئے مسلمانوں کے جمع کیے ہوئے سامان پر غاصبانہ قبضہ کر لیا اور اسے مندر کی تعمیر میں لگوا دیا۔ جب مسلمانوں نے باز پرس کی تو اس نے اسلام اور بانی اسلام کی شان میں گستاخیاں کیں۔ متھرا کے قاضی نے ملا عبدالنبی صدر الصدور کی عدالت میں استغاثہ دائر کیا۔ عدالت نے برہمن کے نام سمن جاری کیا۔ اس نے سمن کی تعمیل سے انکار کر دیا اور فساد پر اتر آیا۔ معاملے کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اکبر نے بیربل اور ابوالفضل کو واقعہ کی تفتیش پر مامور کیا۔ انہوں نے برہمن کو قصوروار پایا۔ اکبر رانی جودھا بائی کی وجہ سے معاملہ رفع دفع کر دینا چاہتا تھا، لیکن ملا عبدالنبی برہمن کی حکم عدولی اور سرکشی سے پہلے ہی برافروختہ تھے۔ انہوں نے اکبر کی نارضامندی کی

[1] مہابھارت، ص ۸-۲۵، آئین اکبری، جلد ۳ ص ۱۴۵، ۲۹۳، ۲۹۸ [2] آئین، جلد ۱ ص ۱۸۹۔

پروانہ کرتے ہوئے برہمن کو پھانسی پر لٹکوا دیا۔ اکبر کی ہندو رانیوں نے جنھیں بدایونی "دختران راجہائے عظیم ہند" لکھتا ہے۔ واویلا شروع کر دیا کہ ملاؤں کو اتنا سر چڑھا لیا گیا ہے کہ وہ بادشاہ کی مرضی کا بھی خیال نہیں کرتے۔[1]

ایک طرف تعدد ازدواج کا مسئلہ پہلے ہی سے اکبر کی فشار خاطر کا سبب بنا ہوا تھا اور بقول استاد محترم پروفیسر سید نبی ہادی" دربار میں بادشاہ کے کان علمائے دین کی یاوہ گویوں باتیں اور حرام و حلال کے نکتے سنتے تھے اور حرام سرا میں آنکھیں حرم معصوم کے خوبصورت چہروں کو دیکھتی تھیں۔ یہ کیفیت اکبر کی جان کو دوگونہ عذاب سے کم نہ تھی۔ وہ اپنے ضمیر کی تسکین کے لئے اس کے علاج کا جویا تھا"[2] دوسری طرف یہ واقعہ پیش آگیا جس نے اکبر کی ذہنی کشمکش میں مزید اضافہ کر دیا۔ اسی دوران ملا عبدالنبی کے کسی مخالف نے اکبر کو یہ سمجھا دیا کہ ملا عبدالنبی جو امام ابوحنیفہ کی اولاد ہونے پر فخر کرتے ہیں انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کے جد امجد کے نزدیک شاتم رسول سزائے موت کا مستحق نہیں ہے۔[3] اکبر جو ملا عبدالنبی سے پہلے ہی کبیدہ خاطر تھا۔ یہ معلوم ہونے پر کہ وہ سزائے موت دینے کے مجاز نہیں تھے ان سے بدظن ہوگیا۔ یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا کہ انہیں دنوں اکبر کی سالگرہ کی تقریب کی تاریخ پڑ گئی۔ شیخ مبارک بادشاہ کو سالگرہ کی تہنیت دینے پہنچا۔ بادشاہ کو مغموم پاکر اس نے سبب دریافت کیا۔ اکبر نے واقعہ بیان کیا۔ شیخ مبارک نے اکبر سے کہا کہ بادشاہ خود امام عادل اور مجتہد ہے، وہ علماء کے فتوے کا محتاج نہیں ہے بلکہ اس کا فیصلہ علماء کے لئے قول فیصل ہے۔ یہ بات اکبر کے دل کو لگ گئی۔ اس نے شیخ مبارک سے کوئی ایسی تدبیر کرنے کو کہا جس سے علماء سے

---

[1] منتخب جلد ۲ صفحہ ۔ [2] مغلوں کے ملک الشعراء ص ۲ [3] منتخب جلد ۲ ص ۳۰۔

اسے نجات مل جائے۔ شیخ مبارک کی منھ مانگی مراد بر آئی۔ اس نے ہندوستان میں بھی مصر کے طرز کی اسمٰعیلی شیعی حکومت قائم کرانے کے لئے ایک "محضر نامہ" تیار کیا جس میں اسمٰعیلی شیعی امام کی طرح اکبر کو بھی اعدل، اعقل اور اعلم باللہ کی صفات سے متصف کرکے اس پر علماء کی دستخط سے اکبر کو امام عادل اور مجتہد تسلیم کرا لیا اور اسمٰعیلی شیعہ اماموں کی طرح لامحدود دینی و دنیاوی اختیارات کا مالک بنوا دیا۔ راسخ العقیدہ علماء ایک ایک کرکے ٹھکانے لگا دئے گئے۔ دربار پر شیخ مبارک، اس کے دونوں بیٹوں، شیعہ اور دوسرے مذاہب کے علماء کا غلبہ ہوگیا۔[1]

شاہ عباس صفوی نے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے جب نقطویوں کا قتل عام کرایا تو جان بچا کر ہندوستان بھاگنے والوں میں اس تحریک کا سرگرم مبلغ شریف آملی بھی تھا[2] جو ایران سے بھاگ کر پہلے بلخ پہنچا اور شیخ حسین خوارزمی کے پوتے مولانا زاہد کی خانقاہ میں قیام کیا۔[3] جب اس کی ہرزہ سرائیوں سے مولانا کو اس کے عقائد کا علم ہوا تو انہوں نے اسے وہاں سے نکال دیا۔ وہ بلخ سے بھاگ کر دکن پہنچ گیا۔

دکن میں اس زمانے میں شیعیت کا دور دورہ تھا۔ لوگوں نے شیعہ عالم سمجھ کر اس کی پذیرائی کی لیکن اس نے وہاں بھی شیعیت کے پردے میں اپنے عقائد کی تبلیغ شروع کر دی لوگوں کو معلوم ہوا تو اس کے قتل کے درپے ہوئے۔[4] وہ دکن سے بھاگ کر شمالی ہند پہنچ گیا۔

شمالی ہند پہنچ کر وہ اکبر کے دربار میں باریاب ہوا۔ خواجہ کلاں کا بیان ہے کہ پہلی ہی

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے: "دین الٰہی اور اس کا پس منظر"، پروفیسر محمد اسلم، ص ۹۱ تا ۹۵ [2] تاریخ عالم آرای عباسی، جلد ۲۔ ص ۳۲۵ [3] مبلغ الرجال، ورق ۳۲ الف [4] منتخب جلد ۲ ص ۲۴۶۔

ملاقات میں اس نے بادشاہ سے کچھ ایسے "حرفہائے ناہموار" کہے جو خاطر اقدس کو بہت پسند آئے۔ اس نے اسے ہزاری منصب دے کر اپنے مقربین میں شامل کرلیا۔[۱] ایرانی مورخ اسکندر منشی کا بیان ہے کہ اکبر شریف آملی کو اپنا پیر و مرشد سمجھتا تھا اور اس کی بڑی تعظیم کرتا تھا۔[۲] بادشاہ کی دیکھا دیکھی وزیر اور دوسرے امرا اور اہل دربار بھی اس سے عقیدت کا اظہار کرنے لگے۔ اس کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اسی کے توسط سے دوسرے نقطویوں کی بھی اکبر تک رسائی ہوگئی اور انہیں اس کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ ان میں وقوعی نیشاپوری، تشبیہی کاشی، ناظم تبریزی، صوفی مازندرانی، حکیم عباد اللہ کاشانی اور عبد الغنی وغیرہ کے نام بحیثیت ادیب و شاعر تذکروں اور تاریخوں میں ملتے ہیں۔

ابوالفضل جو ابھی تک راہ الحاد پر گامزن تھا۔ شریف آملی سے اکبر کی غیر معمولی عقیدت کو دیکھ کر نقطوی مذہب میں داخل ہوگیا اور شریف آملی سے دوستی کرلی۔ نقطوی تحریک جیسا کہ اس کے عقائد سے ظاہر ہے اسلام اور عربوں کے خلاف عجمی تعصبات پر مبنی تحریک تھی جس کا مقصد اور غرض و غایت اسلام کی بیخ کنی اور حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے عربوں کو جو سیادت حاصل ہے اس کو ختم کرنا تھا۔ اسی لئے اس کا تمام تر زور "ختم نبوت" کے عقیدے پر تھا۔ شیخ مبارک اکبر کو امام عادل اور مجتہد بنا کر لامحدود دینی و دنیاوی اختیارات دلا ہی چکا تھا۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ جب اسے لامحدود اختیار و اقتدار حاصل ہوجاتا ہے تو اس کی ہوس اسے اتنے ہی پر قانع نہیں رہنے دیتی۔ اکبر بھی امام عادل اور مجتہد پر مطمئن نہ رہ سکا۔ وہ نبوت کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسلام سے وہ پہلے ہی برگشتہ ہوچکا تھا۔ اسے

۱ مبلغ الرجال، ورق ۱۳۲ الف ۲ تاریخ عالم آرای عباسی جلد ۲ ص ۳۲۵۔

صرف اتنا یقین دلانے کی ضرورت تھی کہ اس میں پیغمبرانہ صفات موجود ہیں۔ ابوالفضل اور شریف آملی جو پہلے ہی سے اسلام کو ختم کردینے کے درپے تھے۔ انہوں نے منصوبہ بند طریقے سے یہ کام انجام دیا۔

سب سے پہلے مولانا شیرازی نے جو مکہ مکرمہ سے کوئی رسالہ اٹھا لائے تھے۔ اس میں حضرت علیؓ سے منسوب درج ایک روایت سے اکبر کے یہ ذہن نشین کرا دیا کہ دنیا کی مدت سات ہزار سال ہے۔ یہ مدت ختم ہونے والی ہے اور مہدی کے ظہور کا وقت ہے۔[۱] شریف آملی نے محمود پسیخانی کی ایک روایت سے استدلال کیا کہ ۹۹۰ھ میں ایک "مرد حق" پیدا ہوگا جو دنیا سے باطل کا قلع قمع کرے گا۔[۲] شریف آملی کے اس استدلال کی چند شیعہ علما نے حضرت علیؓ کی طرف منسوب ایک اور روایت سے تصدیق کی۔[۳] اس زمانے میں وحدت الوجود کا نظریہ خانقاہوں سے نکل کر سڑکوں اور بازاروں میں آچکا تھا۔ عوام بھی ابن عربی کے نام سے واقف تھے۔ چنانچہ حاجی ابراہیم ان کی طرف منسوب ایک رسالے سے اس "مرد حق" کی نشانیاں بھی ڈھونڈ لایا کہ "زنان بسیار خواہد داشت و ریش تراشی خواہد بود"[۴] ان کی دیکھا دیکھی چند برہمن بھی اپنے گھروں سے کچھ پرانی پوتھیاں لے کر دربار میں پہنچ گئے جن میں یہ پیشین گوئی درج تھی کہ ہندوستان میں ایک ایسا عالم گیر بادشاہ پیدا ہوگا جو ہندوؤں کا احترام اور گائے کی حفاظت کرے گا۔ دنیا میں عدل و انصاف کا نگہبان ہوگا۔[۵] اسی زمانے میں ناصر خسرو کے نام سے یہ دو رباعیاں بھی مشہور کردی گئی تھیں[۶]

۱ منتخب، جلد ۲، ص ۳۰۱ ۲ ایضاً ص ۲۸۶ ۳ ایضاً ص ۲۸۷ ۴ ایضاً ص ۲۹۸ ۵ ایضاً ص ۲۸۶ ۶ ایضاً ص ۲۸۷، ۳۱۲۔

درنہ صد و تسعین دو قراں می بینم — وز مہدی دجال نشاں می بینم
یا ملک بدل گردد یا گردد دیں — سری کہ نہانست عیاں می بینم

ترجمہ: (نو سو بانوے ہجری میں (ستاروں) کا اتصال دیکھ رہا ہوں۔ مہدی اور دجال کا ظہور دیکھ رہا ہوں۔ یا تو ملک میں تبدیلی آئے گی یا دین میں۔ وہ راز جو پوشیدہ تھا اسے عیاں دیکھ رہا ہوں۔)

درنہ صد و ہشتاد و نہ از حکم قضا — آیند کواکب از جوانب یکجا
درسال اسد، ماہ اسد، روز اسد — از پردہ بروں خرامد آں شیر خدا

ترجمہ: (۹۸۹ھ میں قضا و قدر کے حکم سے اطراف سے کواکب ایک جگہ جمع ہوں گے اسد کے سال، مہینے اور دن میں وہ "شیر خدا" پردہ سے باہر آئے گا۔)

اکبر ابھی ان روایات اور رباعیوں پر غور ہی کر رہا تھا کہ ایک شوریدہ سر اکبر کو یہ یقین دلانے پہنچ گیا کہ "حالا صاحب زمانی کہ دافع خلاف و اختلاف ہفتاد و دو ملت از ہندو و مسلم باشد۔ حضرت اند"۔[1]

باقی

[1] منتخب جلد ۲۔ ص ۲۸۷۔

دار المصنفین کی کتابیں

درج ذیل پتوں پر دستیاب ہیں

۱۔ البلاغ پبلی کیشنز، ابو الفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

۲۔ ندوی بک ڈپو۔ پوسٹ بکس نمبر ۹۳۔ ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

"ض"

جاپانی مستشرق نوبوا کی نوتوہارا سے شامی شاعر

وفیق خنسہ کا ایک ادبی انٹرویو

مترجمہ پروفیسر انوار احمد سابق صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی

جاپان کے معروف عرب شناس اور ٹوکیو یونیورسٹی میں رشتۂ ادبیات عرب کے موجودہ استاد نوبوا کی نوتوہارا نے اب تک عرب کے معاصر ادیبوں اور مصنفوں کی تحریروں کے ایک معتد بہ حصے کو جاپانی زبان میں منتقل کیا ہے۔ جو بیشتر عرب کے داستانی ادب سے تعلق رکھتے ہیں جیسے شہید فلسطینی غسان کنعانی کی داستان "عائد الیٰ حیفا" یوسف ادریس کی تصنیف "العسکری الاسود" "الارض" نوشتہ عبد الرحمٰن الشرقاوی، دومۃ وحامد مصنفہ طبیب صالح، حلیم برکات کی ادبی کاوش "ستۃ ایام" کے علاوہ یحیٰی طاہر عبد اللہ علی زین العابدین اور کچھ دوسروں کی بکھری ہوئی کہانیاں وغیرہ۔ اسی طرح استاد موصوف نے یوسف ادریس کی ادبیات میں تشخص مصر اور اسلام اور طٰہٰ حسین کی تالیف "الایام ولا دیب" سے متعلق جو ادبی آثار کا سلسلہ ہے ان میں ان کی مشارکت کی ہے۔ علاوہ برایں ان کی تالیفات میں متعدد مقالے ہیں جو مسئلہ فلسطین، غسان کنعانی کے رشحات فکر اور سرزمین عرب میں اپنی اقامت کے دوران کے تجربات و مشاہدات سے

* مسکن کوٹھی، باقر گنج گولہ روڈ۔

تعلق رکھتے ہیں۔

استاد نوتوہارا کا ایک تحقیقی مقالہ بزبان انگریزی 'صحرائے سوریہ' میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔ یہ مقالہ لفظ السماء کے مفردات سے متعلق ہے۔

سطور ذیل میں ان کے ایک انٹرویو کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ جسے شامی شاعر وفیق خنسہ نے ٹوکیو میں استاد نوتوہارا سے اثنائے ملاقات لیا تھا۔ اس گفتگو کے دوران نوتوہارا نے متعدد مسائل مثلاً جاپان اور یورپ میں شرق شناسی، جاپان میں معاصر داستانی ادب، جاپان میں داستان کوتاہ بحران و انتشار کے عالم میں عربی اور جاپانی شاعری کا مقایسہ، ہایکو اور تانکاہ کے مختصات، مصنف کی آزادی اور سنسر پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ عربی زبان میں ترتیب دئے گئے اس مصاحبے کا فارسی ترجمہ ایک ایرانی اسکالر حسن کیا نبور نے کیا تھا اور ماہنامہ کیسان فرہنگی کے شمارہ ۱۷ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مصاحبہ جاپان اور سرزمین عرب کے ادب و ثقافت کی بابت مفید اطلاعات فراہم کرتا ہے۔ اس کی افادیت و اہمیت کے پیش نظر اسے اردو زبان میں منتقل کیا گیا ہے۔

س۔ عالم عرب کے قارئین کی اطلاع جاپانی زبان اور جاپان کی عرب شناسی وغیرہ کی بابت بہت کم ہے۔ آپ بتائیں کہ آخر جاپان میں عربی ثقافت و ادب کی جانب توجہ کس طرح اور کب سے شروع ہوئی اور فی الحال عرب شناسی کا ذوق و رجحان وہاں کس مرحلے میں ہے؟

ج۔ ہمارے تجربات کی تاریخ بہت قدیم نہیں ہے۔ وقت ہمیشہ مخصوص اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ہم نے اس کام کا آغاز تقریباً تیس سال پیشتر کیا تھا اور اتنے دنوں کی مدت

ایک ایسے اہم و متنوع موضوع یعنی ادب و ثقافت عرب کے لئے بہت زیادہ نہیں ہے۔

اس کے باوصف جن جاپانی دانشوروں اور محققوں نے شرق وسطیٰ سے مربوط مسائل و اوضاع اور مجموعی طور پر اسلامی عرب کی تہذیب کی مختلف انواع مثلاً تاریخ، ادبیات، سیاست و مذہب کے بارے میں تحقیقی کاوشیں کی ہیں وہ چار نسلوں پر محتوی ہے۔

نسل اول: یہ موضوعات کا انکشاف کرنے والی نسل تھی۔ جو پہلی بار اسلامی اور عربی مسائل کی تلاش و تحقیق میں مشغول ہوئی اور دوسروں کی توجہ کو ان موضوعات کی جانب مبذول کیا۔ اس نسل نے فی الواقع اہل جاپان کو اسلامی تہذیب کی دنیا سے متعارف کیا اس کے معروف افراد میں ماہیجیما شنجی MAEJIMA SHINJI توشی ہیکو ایزوتسو TOSHI HIKO IZUTSU خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے اس میدان میں اپنے بیش قیمت کارناموں کے اہم نقوش چھوڑے ہیں۔ جاپان کے طول و عرض میں یہ اپنی تحقیقی مساعی کی بنا پر پہچانے جاتے ہیں۔ توشوہیکو ایزوتسو فلسفہ یونان اور ایشائی فلسفہ کی راہوں کو طے کرتے ہوئے یورپی فلسفہ کے راستے سے اسلامی عرب کی دنیا میں داخل ہوئے۔ وہ پہلے جاپانی ہیں جنھوں نے قرآن مجید کا جاپانی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ بہرحال ان دونوں جاپانی دانشوروں نے نسل دوم پر اپنے اثرات خاص طور پر مرتب کئے۔

نسل اول کے بعد اسلامی ثقافت کی طرف توجہ اور اس کے تتبع میں فزونی پیدا ہوئی جس کے نتیجے میں طلاب اسلامیات اور عرب شناسوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ اس میدان میں تحقیقی کوششوں کا معیار و وزن بڑھا اور شرق شناسوں کے درمیان روابط قائم ہوئے۔ تجربات و مطالعات میں تبادلہ خیالات کی صورتیں پیدا ہوئیں۔ کھلے جلسوں میں نوع بنوع افکار و نظریات سے متعلق بحثوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس

ضمن میں استاد اتاجاکئی یوزو ITAJAKI YOZO کا ذکر نامناسب نہیں ہوگا۔ ان کی واضح خصوصیت ان کی تنظیمی صلاحیت تھی۔ انہوں نے تحقیقات کے میدان میں شرق شناسی سے جڑے ہوئے محققین کی کارگزاریوں اور سرگرمیوں کو منظم و منضبط کرنے میں لائق تحسین کارنامے انجام دئے ہیں۔ اسی طرح محققوں کی تصنیفات کی طبع و اشاعت کے طریق کار کو اصول و ضابطے کی راہ پہ لگایا۔ مشرق وسطیٰ کے مسائل و معاملات سے خصوصی دلچسپی رکھنے والے بیشتر محققوں نے یوزو کے تحقیقی منصوبوں میں شرکت کی۔ وہ ہمیشہ ریسرچ اسکالرز کو اسلامی عرب کے صیغے میں تخصص کے حصول کے لئے شوق دلاتے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہے اور آج بھی وہ اس نیک کام میں مشغول ہیں۔ ان دو نسلوں کی تلاش و تحقیق کی برکت سے جاپان میں شرق شناسی نے ایک تحریک کی صورت اختیار کرلی ہے۔ میرا تعلق تیسری نسل سے ہے۔ ہم اس امر کے لئے کوشاں ہیں کہ اس میدان میں اپنی پہچان اور جاپان کے قاریوں کی پہچان کو زیادہ موثر و معتبر بنائیں جب کہ چوتھی نسل نوجوانوں پر مشتمل ہے۔

س۔ جاپان میں عرب شناسی کا نشوو ارتقا اقتصادی ترقی و خوش حالی کے ساتھ ساتھ ظہور میں آیا ہے۔ کیا اس میدان میں معیشت و سیاست نے اساسی اثرات مرتب کئے ہیں ؛ یا دوسرے عناصر کی بھی اس میں کارفرمائی ہے۔

ج۔ جاپان میں سیاست عرب شناسی کے مسئلے میں زیادہ دخل انداز نہیں ہوئی ہے۔ اس کے اصلی محرک خود تحقیق کے مختلف شعبے ہیں مثلاً تاریخ کا مطالعہ، مذاہب و مسالک کی تحقیق، اقوام عالم کے باہمی رشتوں اور رابطوں کا جائزہ، ادبیات کا ملاحظہ وغیرہ، ان امور کے علاوہ خود تحقیقی کام کرنے والوں کی ذاتی توجہ اور ہمت بھی اس

مسئلے میں اثر رکھتی ہے۔ دراصل یہ جذبہ شوق ہے جو بحث و تحقیق کی راہ پر چلتے رہنے کے لئے رغبت دلاتا ہے۔

س۔ مغربی دنیا میں کچھ مخصوص عوامل نے وہاں کے باشندوں کو شرق شناسی کی طرف مائل کیا ہے۔ مثلاً پندرہویں صدی عیسوی میں یورپ میں تلاش و تفحص کے میدان میں غیر معمولی دلچسپی، اپنی منڈیوں کی توسیع و فزونی کے لئے یورپی ملکوں کی آپسی رقابت، بورژوائی طبقے کی پیش رفت اور صنعتوں کی تحیرانگیز افزائش وغیرہ۔ ان عوامل نے کچھ اور اسباب کے ساتھ عالم مغرب میں مشرق شناسی کی کوشش کو تیز تر کردیا ہے، لیکن جاپان میں یہ صورت کس طرح پیدا ہوئی ہے۔؟

ج۔ آپ سیاسی و اجتماعی احوال کی جانب توجہ مبذول کرنا چاہتے ہیں۔

فطری طور پر یہ اوضاع انسانی زندگی میں اور بین الاقوامی روابط میں نہایت موثر ہوتے ہیں لیکن عرب شناسی کے مسئلے میں اس کا بہت زیادہ اثر نہیں رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جاپان میں سیاسی و اجتماعی صورت حال مشرق شناسی کی حرکت و عمل کی بنا ڈالنے اور اس کی رہنمائی کرنے کی موجب و محرک نہیں ہوئی ہے لیکن ایک طویل عرصے تک پٹرول اور پٹرول کی تولید کرنے والے عرب ملکوں کی جانب جاپان نے توجہ کی ہے۔ اس کے سبب اس عرصے میں ان افراد کی تعداد میں اضافہ ہوا جو عربی زبان سیکھنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ لیکن جب پٹرول اپنی سابقہ اہمیت کو قائم نہیں رکھ سکا تو ان کی توجہ کم ہونے لگی۔ اس انحطاط کے باوجود مشرق شناسی کی حرکت و سرگرمی جاری رہی اور اس میں وسعت و فزونی پیدا ہوئی۔ کیونکہ اس کا تعلق عرب ملکوں اور جاپانی حکومت کے مابین رسمی روابط سے نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حقائق کی تلاش و جستجو ہی جاپانی محققین کو دنیائے عرب سے مربوط رکھتی ہے۔

کسی حقیقت کی جستجو میں محقق کی حیثیت کی پہچان اس کی ذاتی توجہ کی کیفیت پر مبنی ہوتی ہے۔ میں یہاں اندرونی عوامل و محرکات کی بات کررہا ہوں۔ مثلاً کچھ سال پہلے تک ٹوکیو یونیورسٹی جو جاپان کی عظیم ترین یونیورسٹی ہے، وہاں مشرق وسطیٰ کے مسائل کے مطالعات کے لئے کوئی شعبہ نہیں تھا۔ آپ خود بہت سارے جاپانی مشرق شناسوں سے بخوبی واقف ہیں، ان سے دریافت کرسکتے ہیں کہ انہوں نے آخر کیوں اس میدان کا انتخاب کیا۔ ایسی صورت میں آپ مطمئن ہوجائیں گے کہ شرق شناسی اور عرب شناسی کی جانب ان کے میلانات کا محرک سیاست حاضرہ یا معاشی وسیاسی عوامل ہرگز نہیں ہیں۔

س۔ جاپان میں عرب شناسی گذشتہ صدی میں کیوں شروع نہیں ہوئی؟ اس کا آغاز ان کے وطن میں یورپ کی مشرق شناسی کے واسطے سے ہوا ہے۔ میں اس مسئلے کے اسباب آپ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

ج۔ ہم لوگ شروع میں سرزمین عرب کی بابت کچھ نہیں جانتے تھے۔ آج بھی ہماری واقفیت اس کے متعلق زیادہ نہیں ہے۔ ہم آغاز میں اہل مغرب کے طریق کے مقلد تھے مثلاً جاپان کے محققوں نے اسلام کا مطالعہ یورپ میں کیا ہے عرب ملکوں میں نہیں۔ آغاز میں دنیائے عرب اور اسلام کی بابت جاپانیوں کی قدر شناسی یورپی مشرق شناسوں کے مطالعات پر مبنی تھی لیکن جاپانی شرق شناسوں کی دوسری نسل نے براہ راست سرزمین عرب کی جانب رُخ کیا۔ ایمانداری کا تقاضا ہے کہ اس امر کا اعتراف کیا جائے کہ استاد اتا جاکی اولین شخص تھے۔ جنھوں نے اس مسئلے کی جانب توجہ کی۔ وہ قاہرہ تشریف لے گئے اور وہاں رہ کر انہوں نے عربی زبان وثقافت کی بابت واقفیت حاصل کی۔ آج بھی ہم اسی روش پہ چل رہے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ اول اول ہم نے مغرب کے

واسطے سے عربی تہذیب وتمدن کا پتہ لگایا۔ لیکن فی الحال ہماری کوشش یہ ہے کہ براہ راست اس مسئلے سے متعلق اطلاعات حاصل کریں۔

س۔ عرب کے بہت سارے دانشور اہل مغرب کی شرق شناسی کی سعی وکوشش کو ناقابل اعتبار تصور کرتے ہیں۔ مثلاً عبداللہ العروی اپنی تصنیف بعنوان ایدیولوژی معاصر عربی میں لکھتے ہیں کہ شرق شناسی دراصل پہلے سے معین کئے گئے تصورات پر مبنی ہے۔ جس کے نتیجے میں مسائل کے ادراک میں وہ ناکام رہتے ہیں۔ اسی طرح ادوارد سعید نے اپنی کتاب موسوم بہ "خاورشناسی" میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ تمام شرق شناس نسل پرست مسیحی ہیں۔ حسن حنفی بھی اپنی کتاب "نوسازی و میراث فرہنگی" میں شرق شناسی کو ایک مسیحی امر سمجھتے ہیں، جس کا مقصد اسلام کو نابود کرنا ہے۔ آپ کا خیال جاپان میں عرب شناسی کی سعی وتلاش کی بابت کیا ہے؟

ج۔ میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش تو کرتا ہوں مگر معلوم نہیں میرا یہ جواب کافی ہوگا کہ نہیں، میں اس ضمن میں تین بنیادی نقطوں کی طرف نشاندہی کرتا ہوں۔

(الف) ہم بتدریج اس شئے کی جانب متوجہ ہوئے ہیں۔ ابھی حال میں شرق شناسی سے متعلق کچھ نئے مسائل سے ہم بوجہ احسن آشنا ہوسکے ہیں۔ ابتدا میں ہم مغرب کے شرق شناسوں کی کہی ہوئی باتوں کی تکرار کرتے تھے۔ اطلاعات کے حصول کے لئے کوئی دوسرا ذریعہ وماخذ ہمارے اختیار میں نہیں تھا۔

(ب) ہمیں احساس ہوا کہ اہل مغرب حقائق کو صحیح طور پر بیان نہیں کرتے فلسطین کا مسئلہ اس کی بین مثال ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مسائل کو درست طور پر سمجھنے میں ہم سے تاخیر ہوئی ہے لیکن آخر کار اب ہم نے مسئلے کو سمجھ لیا ہے۔ اس سے پہلے ہمارا پریس اور نشرواشاعت کے

کے دیگر وسائل فلسطین کے معاملات کو یورپی اور امریکی ذرائع سے نقل کر کے جاپان کے
لوگوں کے لئے شائع کرتے تھے لیکن اب صورت حال بدل گئی ہے۔ خود روزنامہ نگاروں
نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے کہ اہل مغرب کا پروپگنڈا حقیقت سے عاری ہوتا ہے۔ اہل
مغرب کی تحریفی کارگذاریوں کو آشکارا کرنے میں استاد اتاجاکی کی مساعی لائق تحسین ہے۔
اس طرح ہم خود ہی اس کام سے وابستہ ہوئے اور راہ پہ چل پڑے تاکہ حقائق کا براہ راست
مشاہدہ کریں۔ اس کے نتیجے میں حقیقت کی تشخیص میں ہم کامیاب ہوسکے اور یہ بات ہم نے
سمجھ لی ہے کہ اہل مغرب کی تصنیفات کو احتیاط و ہوش مندی سے پڑھنا ضروری ہے۔

(ج) جاپان کے کچھ نوجوانوں کو اسرائیلی سفارت حصول تعلیم کے لئے حکومت
اسرائیل کے خرچ پر اسرائیل بھیجتی ہے تاکہ ان نوجوانوں کے علمی ثمرات کو وہ اپنی منفعت کے
لئے استعمال کرے لیکن بیشتر نتیجہ اس کے برعکس مرتب ہوتا ہے۔ ایک جاپانی روزنامہ نگار
نے اسرائیل میں تعلیم حاصل کی۔ جب وہ جاپان واپس آیا تو اہل فلسطین کی حمایت کرنے
لگا۔ کیونکہ وہ اپنی آنکھوں سے اسرائیلی پروپگنڈا اور وہاں کے اصل واقعات کے تضاد
کو دیکھ چکا تھا۔ مثال کے طور پر جاپانی محقق اوئی واکاوا کازوماسا کا نام لیا جاسکتا ہے
OI WA KAWA KAZUMASA جو پچاس سال کی عمر میں وفات پاگئے۔ وہ اس
میدان میں بڑے متحرک و سرگرم تھے اور اس سلسلے میں کثیر و وافر اطلاعات رکھتے تھے۔

اس طرح اب ہم فلسطین کے بارے میں اصل حقائق و معلومات سے آگاہ ہوکر اس کے
بارے میں فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہوگئے ہیں اور حکومت اسرائیل ہمیں کوئی دھوکہ
نہیں دے سکتی۔

(س) آپ نے ایک کتاب بعنوان "مصری ھاکجا ھتنذ" لکھی ہے اس کتاب میں

آپ نے مصری شخصیت سے متعلق گفتگو کی ہے۔ کیا آپ کے خیال میں ہم ایک مصری
شخصیت رکھتے ہیں؟ اسی طرح کیا شامی شخصیت یا عراقی شخصیت کا تصور مناسب
ہوگا۔ یا یہ کہ ہم تمام ساکنان عرب صرف ایک شخصیت کے حامل ہیں اور وہ ہے عربی شخصیت؟

(ج) جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہم جاپانی دانشوروں کی واقفیت عربوں کی بابت
ناکافی ہے۔ لہذا ہم اس کے مکلف ہیں کہ جاپانیوں کو عربی شخصیت کی اندرونی حیثیت
و ماہیت سے باخبر کریں۔ بلاشبہ عربی شخصیت کا وجود یقیناً ہے لیکن مصری شخصیت یا
شامی شخصیت اور عربی شخصیت کے مابین تضاد و تناقض نہیں کیونکہ عربی شخصیت کے دائرے
سے مصری شخصیت باہر نہیں ہے۔ ڈاکٹر جمال ہمدان نے اس مسئلے کی توضیح اپنی کتاب "شخصیت
مصر" میں بوجہ احسن کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسائل ایک دوسرے سے جڑے ہوئے
ہیں۔ اسی بنا پر میں بھی ان دنوں شامی شخصیت کا مطالعہ وہاں کے باشندوں کے
ماحول میں ذکر کر رہا ہوں۔ میں کتابوں میں پیش کردہ افکار و ادبیات کے ذریعہ عرب کے
اصلی و اساسی اوضاع پر غور کرتا ہوں۔ شخصیت مصر کے مرموز حقائق کو منکشف کرنے
میں میں نے دس سال صرف کئے۔ گو اس کے نتیجے سے میں کسی حد تک مطمئن ہوں، تاہم اسے
کافی نہیں سمجھتا۔ ان دنوں میں نے اپنی جستجو و مطالعہ کا ہدف عربستان کے جغرافیائی ماحول
کو بنایا ہے۔ اس میں اور انسانی اوضاع و احوال کے مابین نہایت قریبی رشتہ ہے۔ آپ
یقیناً اس خطے کے جغرافیائی تنوع کی ماہیت سے واقف ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نوع
انسانی کا مسکن اور اس کا ماحول اس کی کارکردگی کا ایک نہایت اہم عنصر ہوتا ہے۔ انسان
اپنے گرد و پیش سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن گرد و پیش اور ماحول کے ساتھ انسانوں کے لئے
موافقت و ارتباط برقرار رکھنا بہت سہل بھی نہیں ہے۔ مثلاً آپ صحرائے شام کے جغرافیائی

حالات پر نگاہ رکھیں، ایک شامی صحرائے شام میں حصول آب کے لئے پچاس مقامات کو کھودتا
ہے تب اسے ایک جگہ پانی دستیاب ہوتا ہے۔ چشمۂ آب کے وجود کی بنا پر اس جگہ کو وہ
اپنی جائے قرار بناتا ہے۔ ماحول کے ساتھ صحرائے شام کے باشندوں کا یہ رشتہ میرے لئے
حیرت انگیز اور پرکشش ہے۔ میں اس رشتے پر تعمق کی نگاہ رکھتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں
کہ اس راز کا انکشاف ہوسکے۔

(س) یورپ اور امریکہ کے بہت سے دانشوروں کا خیال ہے کہ جاپان کے سابق
زمانہ وا شووا کا دور حکومت جاپانی ناول نویسی کا عصر طلائی تھا۔ جاپان کے دور حاضر کے
ناول نگار اس عصر طلائی کے ناول نگاروں کے درجہ کو بمشکل پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے
بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

(ج) عصر شووا جاپانی ناول نگاری کا بڑا درخشاں عہد تھا۔ اس میں ناول نگاری
کا معیار و مرتبہ بہت بلند تھا۔ یہ حقیقت ہے۔ مگر زمانہ حال میں جاپان میں ادبی سرگرمیاں
تعطل وجمود کے مرحلے میں ہیں۔ اس وقت یہ تصور کرنا یکسر محال ہے کہ جاپان کے موجودہ
ناول نگار عصر شووا کے مرتبے کو پہنچ سکیں گے۔ یہاں موضوعات کے فقدان کا بھی احساس
ناول نویسوں کو ہو رہا ہے۔

(س) شاعر عرب عنترہ بن شداد کہتا ہے "ھل غادر الشعراء من متردم"
کیا کوئی ایسا نغمہ ہے جس کو شاعروں نے نہیں گایا ہوگا۔ لیکن یہ شاعر معلقہ کی سخن سرائی میں
شامل ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ موضوعات کی دستیابی میں کوئی مشکل نہیں ہے۔ دائماً
ایسے اسباب وعوامل ظہور میں آتے رہتے ہیں جو موجود موضوعات سے زیادہ عمیق اور
قابل توجہ ہوتے ہیں۔ آپ کی نظر میں جاپان میں ناول نویسی کی دنیا میں جمود وسکون کے

کیا اسباب ہیں؟

(ج) اس دور میں تمام عالم میں غیر معمولی اور حیرت انگیز صلاحیتوں کے مالک
افراد نہیں پیدا ہو رہے ہیں۔ جاپان میں کبھی ادبی تحریک کے باوجود غیر معمولی ذوق و
ذکاوت رکھنے والے ادیبوں کی واضح کمی نظر آتی ہے۔ ماضی قریب میں جاپان نے لائق
ستائش معاشی ترقی کی۔ خوش حالی اور تمدنی تحول کے زیر اثر جاپانی سعی وتلاش کی
راہ بھول گئے۔ تلاش حق میں اپنے آپ کو آزمائش وابتلا میں ڈال کر راستوں کی مشکلات
سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ چھوڑ بیٹھے۔ جاپانی معاشرہ میں ان دنوں آسودگی اور بے فکری
ہے۔ جستجوئے حق کے لئے جان جوکھم میں ڈالنے کے عناصر وعوامل میں کمی پیدا ہوگئی ہے۔
جب ادبیات کو ہم تفریح ولذت یابی کا وسیلہ بناتے ہیں تو اب میں ابتکار وابداع ناپید
ہوجاتا ہے۔

(س) نظام سرمایہ داری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

(ج) جاپانی معاشرہ اقتصادی طور پر بہتر حال میں ہے۔ ثروت مندی اور خوشحالی
نے جاپانیوں کی سعی وتلاش کی تشنگی کو بجھا دیا ہے۔ جاپان میں ان دنوں ادبی کتابوں خواہ
وہ یورپی ہوں یا ایشیائی اور خود جاپانی تصنیفات ہوں ان کی فروخت میں کمی پیدا ہوگئی
ہے۔ یہ ایک افسوس ناک صورت حال ہے لیکن حقیقت ہے۔

(س) جاپان میں ادبی انعامات خصوصاً ناولوں اور افسانوں پر دئے جانے والے
انعامات کی کیفیت کیا ہے اور اہل قلم اور قاری کے تعلق پر ان کے کیا اثرات پڑ رہے ہیں۔

(ج) ہمارے وطن جاپان میں ناول نگاری کے لئے دو انعام مختص ہیں۔ جو غیر معمولی
اہمیت وقعت ووقار کے نشان ہیں۔ پہلا انعام اکوتا جاوا شو انعام ہے۔ یہ انعا

اونچے درجے کے ادبی آثار کے لئے ہے۔ اس انعام کے حصول کنندہ کی شہرت پورے ملک میں ہو جاتی ہے۔ اس کی کتابیں بڑی تعداد میں فروخت ہونے لگتی ہیں۔ اہل فن کو ان کی حصولیابی کی فکر رہتی ہے۔ دوسرا انعام نائوکی شو NAOKI - SHO کے نام پر ہے۔ یہ عوامی ادب کا انعام ہے۔ جاپانی قارئین عموماً شوق و رغبت کے ساتھ ایسے مصنفوں کی کتابیں خریدتے ہیں جو مذکورہ دو انعام میں سے کسی ایک کے حصول میں کامیاب ہوئے ہوں۔

(س) کیا یہ دونوں انعام حکومت کی جانب سے ہوتے ہیں۔

(ج) نہیں حکومت ان انعامات میں کسی سطح پر دخل انداز نہیں ہوتی۔ انعامات کے اخراجات اشاعت وطباعت کے ادارے ادا کرتے ہیں۔ ان انعامات کی اہمیت کے بارے میں ایک ضروری امر کی وضاحت لازم ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم جاپانی خدا نہیں رکھتے۔ زندگی کی مشکلات کے حل کے جو مقدس ذرائع آپ سرزمین عرب میں رکھتے ہیں ان کا تصور ہمارے وطن میں نہیں ہے۔ ہم خود اپنے آپ پر بھروسہ کرتے ہیں اور مشکلات کی چارہ جوئی ہم ناول نویسوں سے بھی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جاپانی قارئین ادبی آثار سے متعلق انعات کے نشر واشاعت کا انتظار دلچسپی کے ساتھ کرتے ہیں لیکن فی الحال جاپان میں غیر تسلی بخش صورت حال ہے۔ اس کا سبب عظیم اہل فن اور دانشوروں کا فقدان ہے۔

(س) عرب ملکوں میں شعری تصنیفات کے فروخت میں سال بہ سال کمی آرہی ہے جب کہ فکشن کے فروخت میں استحکام واستقلال کی صورت ہے۔ جاپان میں صورت حال کیسی ہے؟

(ج) میرے خیال میں جاپانی قارئین کا موازنہ عرب قارئین سے مناسب نہیں ہوگا۔ جاپانی قارئین زیادہ کتابیں خریدتے ہیں یہاں تک کہ گھر گرہستی سے وابستہ خواتین بھی کتاب فروشی کے مراکز پر کتابیں ڈھونڈتی نظر آتی ہیں۔ جب کہ عرب میں قاریوں کی تعداد کم ہے اور ادبیات میں دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد اور بھی کم ہے یہ صورت حال معاشی، سیاسی اور تعلیمی تفاوت کی بنا پر ہے لیکن شعری کتابوں کے معاملے میں جاپان میں تشفی بخش صورت نہیں ہے۔ جاپان میں نوجوانوں کی توجہ ان کی جانب کم ہے۔

س۔ جاپان میں مختصر افسانوں کا کیا حال ہے؟

ج۔ جاپان میں مختصر افسانوں کا زیادہ چلن نہیں ہے۔ اس شعبۂ ادب کے خوبصورت اور دلکش نمونے کم ہیں۔

س۔ مختصر افسانہ نویسی جاپان جیسے معروف اور سرمایہ دارانہ نظام سے شاید مطابقت پیدا نہیں کر سکی ہے؟ آپ کا کیا خیال ہے۔

ج۔ میڈیا کے منتظمین و ادب جاپان میں مختصر افسانوں کو زیادہ لائق توجہ نہیں سمجھتے۔ جرائد و مجلات میں جو افسانے چھپتے ہیں وہ صرف لطف و لذت کے موجب ہوتے ہیں۔ ان کا معیار بلند نہیں ہوتا۔ ایسی صورت کا سبب کیا ہے۔ اب تک مجھے اس کا معقول اور تشفی بخش جواب نہیں مل سکا ہے۔

س۔ کیا آپ کی نظر میں جاپان میں فکشن عصر شوا میں عالمی معیار کو پہنچا ہے یا نہیں؟

ج۔ میں اس صنفِ ادب کا متخصص نہیں ہوں، پھر بھی اس کی بابت کچھ عرض

کرتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یورپی فکشن عالمی معیار و امتیاز رکھتا ہے؟ بالفرض
ایسی صورت ہو بھی تو یہ دا ستایوسکی جیسے اصحاب فن کے لئے برتری کا موجب نہیں
ہوسکتا۔ جب میں عربی کے مختصر افسانہ نگاروں کو مثلاً یوسف ادریس، طیب صالح
یا چند دوسروں کو پڑھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں وہ بھی عالمی سطح پر اپنا مقام رکھتے
ہیں اور اپنے فنی مکارم کے سبب نہایت پر کشش ہیں۔ عربی کے بہت سے مختصر افسانوں
اور ناولوں کا گہرا اثر مجھ پر ہے۔ اسی طرح جاپانی فکشن بھی اسی سطح پر اپنا مقام رکھتا ہے
تاکیدا تائی جون کے بیشتر ناول اور تانیزاکی اور آبی کوبو کے کچھ ناول اسی معیار کے
ہیں۔ میرے خیال میں ادب میں مطمح نظر بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ صاحب فن کا
نقطۂ نظر سے صمیمانہ رابطہ ہونا چاہئے۔ مصنف کا نظریۂ حیات اس کے ادب کو بے حد
متاثر کرتا ہے۔ میں نے غسان کنعانی کے ادبی آثار کا ترجمہ جاپانی زبان میں کیا ہے۔ غسان
کنعانی انسانی نقطہ نظر سے اونچا مقام رکھتے ہیں۔

س۔ آپ کا رابطہ عربی شاعری سے بہت زیادہ مستحکم نہیں ہے۔ اس کا سبب عربی
شاعری کی خصوصیات ہیں یا کوئی اور سبب ہے؟

ج۔ میں جاپانی شاعری سے بھی زیادہ رابطہ نہیں رکھتا۔ اگرچہ شعری ادب کا مطالعہ
مجھے اچھا لگتا ہے۔ شعری ادب سے دلچسپی کے معاملے میں اہل عرب اور مردمان جاپان کے مابین
بڑا تفاوت ہے۔ جاپان میں شاعری کچھ ہی لوگوں کے درمیان مقبول ہے۔ عام جاپانیوں
کو شعر و شاعری سے زیادہ واسطہ نہیں۔ میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں استادوں کی
صحبتوں کے زیر اثر شعر کہتا تھا۔ بعد کو اس سے کنارہ کش ہوگیا۔ کیونکہ جیسا میں چاہتا
تھا اس طرح اپنے جذبات و واردات قلبی کو بیان نہیں کرسکتا تھا۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں

کہ شاعری میں ایک غیر معمولی قوت و توانائی ہوتی ہے۔ اس کے اندر ایک پوشیدہ قدرت
کارفرما ہوتی ہے۔ جاپانی شاعر ناکاہارا تشویا کے بعض شعروں میں یہ محاسن ملتے ہیں اور
جاپانی شاعروں کے کلام میں عدیم المثال نکات و اسرار کی کمی نہیں ہے۔ وہاں اچھے شعرا
بھی موجود ہیں جنھیں ہم شاعران ملی تصور کرتے ہیں۔ لیکن عربی شعر ایک قاری اور ایک
شائق شعر کی حیثیت سے میرے لئے ایک دوسرا عالم تصور کرتا ہے۔ اس شاعری میں
رنگِ فطرت کچھ اور ہوتا ہے۔ مثلاً جاپان میں برسات موسم گرما میں ہوتی ہے لیکن عرب
میں زمستان میں بارش ہوتی ہے۔ اس طرح فطرت کے اشاروں کو بیان کرنے والے
کلمات دونوں خطوں کے شعروں میں مختلف ہوں گے۔ کیونکہ ہر جگہ کی شاعری کی خصوصیات
اس کے محیط و ماحول کے زیر اثر ہوتی ہیں۔ میں نے عربی شاعری کو اچھی طرح پڑھا ہے
اور آج بھی پڑھتا ہوں۔ محمود درویش کی تصنیف "یادداشتہای روزانہ اندوہ معمولی"
اس کے شعروں کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوئی۔ دوسری مثال آدونیس کی ہے۔ آدونیس
ایک مشکل موضوع ہے۔ میں اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ تلاش و کوشش کے باوجود
میں اس کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا ہوں۔ میں عربی شاعری کو جاپانی قاریوں کے مطالعہ
کے مدار میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔ صرف شعر قدیم ہی نہیں بلکہ شعر نو کے تراجم سے
بھی انہیں آشنا کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن کام اتنا سہل نہیں ہے کہ ایک عام مترجم اسے کرلے
شعر ایک مخصوص فن ہے جو دشوار ہے، لیکن تحریک و اثر آفرین بھی ہے۔

س۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ تانکا اور ہایکو جاپانی شاعری کے دو نوع ہیں۔
جن پر چینی تہذیب و ثقافت کا کوئی اثر نہیں ہے۔ حالانکہ فلسفہ کے شعبہ میں خالص
جاپانی فلسفہ کے عنوان سے کچھ نہیں ملتا۔ انسان شناسی کے میدان میں بھی یہی صورت حال

ہے۔ آخر تانکا اور ہائکو کے معاملے میں صورت مختلف کیوں ہے؟

ج۔ ہائکو میں شاعر الفاظ پر نہیں بلکہ الفاظ کے درمیان جو رشتے ہوتے ہیں اور جن کی ترکیب سے معنوی کیفیت پیدا ہوتی ہے ان پر تکیہ کرتا ہے۔ الفاظ کے درونی بیرونی اور باہمی ربط و پیوند کو مورد نظر بناتا ہے۔ اسی بنا پر ہائکو نہایت مرجز و مختصر ہوتا ہے۔ جب میں اس کے متعلق کوئی سنجیدہ تنقید پڑھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں نے اس کو اچھی طرح نہیں سمجھا تھا۔ اہل جاپان کے ساتھ ہائکو کے مخصوص ہونے کے کچھ اسباب ہیں:

ہر تہذیب کا اپنا طریقۂ زیست ہوتا ہے۔ جاپان کے لوگ ہائکو میں اپنی مخصوص ثقافت کے اسلوب و آہنگ کے علائم دیکھتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہائیکو چینی ثقافت کے اثر کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ ملکوں اور ملتوں کے کے افکار و احساسات کے اسالیب اظہار و بیان میں اختلاف ہوتا ہے۔ ہائکو مردمان جاپان کے شیوۂ بیان سے مناسبت رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ ان کی زندگی، ماحول، طرح و ترکیب اور جذبات و احساسات کے لحاظ سے یکسر جاپانی شعر ہے۔

س۔ آپ عربی شاعری کی جانب کافی توجہ فرماتے ہیں اور آپ نے عربوں کی شاعری سے اپنا رشتہ و رابطہ بھی برقرار رکھا ہے۔ کیا دوسرے جاپانی قارئین و مخاطبین کے اس سے رشتہ و ارتباط کا بھی یہی حال ہے؟

ج۔ اس مسئلہ کا تعلق ملی تشخص سے ہے۔ آپ لوگ اپنے احساسات کو بسرعت بیان کرنے کے طریقے کو پسند کرتے ہیں۔ جب کہ مردمان جاپان اپنے احساسات کو نہاں خانہ دل میں پوشیدہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنے محسوسات کو طویل مدت تک دل میں محفوظ

رکھتے ہیں۔ آپ کی تہذیب ہمارے ملک کی تہذیب سے مختلف ہے۔ ہمارے ماحول میں سکون و طمانیت ہے۔ ہم فی الفور رد عمل کا اظہار نہیں کرتے، جاپان کے معروف شاعر باشو کے اشعار کی تعداد اسی بنا پر بہت مختصر ہے۔ باشو اپنے ملک میں طویل سفر پر جاتے تھے لیکن اس لمبی مسافرت کا تحفہ ہائیکو کے چند قطعات سے زیادہ نہیں ہوتا۔

ہائکو ایک مرجز اور مرموز صنف شعر ہے، اس میں مدعا کا اظہار صراحت و وضاحت کے ساتھ نہیں ہوتا۔ ایک بار ایک جاپانی شاعر کے ساتھ عرب میں شعر گوئی کی راتوں کی بابت گفتگو کر رہا تھا۔ انہیں بڑا تعجب ہوا، کہنے لگے کہ میں اپنے اشعار دوسروں کے سامنے نہیں پڑھ سکتا، مجھے خجالت کا احساس ہوتا ہے۔ میں بلند آواز میں شعروں کو پڑھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جاپان کے شعراء خلوت گاہوں میں اپنے اشعار گنگناتے ہیں۔ وہ دروں کو بند کر دیتے ہیں اور یکہ و تنہا شعر خوانی کرتے ہیں۔ باشو کے اشعار کی قرأت کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے ذہن و قلب میں طہارت ونزاہت کی کیفیت ہو۔ ادونیس بھی کہتے ہیں کہ میں اپنے اشعار کے پڑھنے والوں سے توقع رکھتا ہوں کہ پڑھتے وقت ان کی ماہیت درونی نہایت نتھری، ستھری، منزہ اور مصفیٰ ہو۔ میرے خیال میں ملتوں کی شخصیت میں تفاوت کے سبب شاعروں کے شیوۂ اظہار میں فرق پیدا ہوتا ہے۔ اکثر عربی اشعار بھی عربی شخصیت کے جذبات و میلانات اور محیط و ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔

س۔ آپ نے فرمایا کہ جاپان میں شعر سننے والوں کی تعداد محدود ہے، لیکن جہاں تک مجھے علم ہے جاپان کے بیشتر لوگ ہائکو پڑھتے ہیں اور گاہے گاہے ہائکو کی صورت میں سخن سرا بھی ہوتے ہیں۔

ج۔ ہمیں مسائل کو ایک دوسرے سے جدا کرکے دیکھنا چاہئے۔ جب ہم شعر گوئی کی بات کرتے ہیں تو ہمارا مقصد تانکا اور ہایکو سے الگ ہوتا ہے۔ ہم شعر اور تانکا و ہایکو کو جدا جدا تصور کرتے ہیں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ ہایکو نے اپنے سامعین کو آج بھی محفوظ رکھا ہے۔ خصوصاً اس نسل کے درمیان جن کی عمر پچاس سال یا اس سے متجاوز ہوتی ہے بہت ساری جاپانی کمپنیاں اور ادارے اپنے ملازموں کے ہایکوؤں کو چھاپنے کے لئے مجلے اور جریدے شائع کرتے ہیں۔ آپ استاد کو بایاشی کو بخوبی جانتے ہوں گے۔ وہ ایک زندگی بیمہ کمپنی میں ملازم ہیں۔ ان کا کام شاعری سے بالکل الگ ہے۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ ہایکو کے بغیر میں زندگی کا تصور نہیں کر سکتا۔

س۔ عرب کے مصنفین اپنی اور دوسروں کی آزادی کے لئے جد و جہد کرتے ہیں جاپان میں لکھنے والوں کی آزادی کا کیا حال ہے؟

ج۔ جاپانی مصنف سنسر سے نہ رنجیدہ ہوتے ہیں اور نہ اس کی مخالفت کرتے ہیں ہم پر بولنے کا سنسر ہے۔ جب ہم کچھ لکھتے ہیں یا کسی چیز کا ترجمہ کرتے ہیں تو اندھا، لنگڑا یا اسی طرح کے دیگر الفاظ جو کسی عیب کو ظاہر کرتے ہوں نہیں استعمال کرتے۔

س۔ کیا آپ یہ سنجیدگی سے فرما رہے ہیں۔؟

ج۔ ہاں ہاں اس کا ثبوت بھی ہے۔ پرانے زمانے میں لفظ کور (اندھا) جاپان میں گالی متصور ہوتا تھا۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ جاپان میں جسمانی طور پر معذور لوگوں کی بڑی تعداد ہے۔ یہ لوگ ایسے کلمات کے استعمال کو اپنے لئے دشنام و اہانت کا موجب سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی مصنف ایسے کلمات استعمال کرتا ہے تو یہ لوگ اس کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ ہم بھی ان بزرگوں کے احساسات کا احترام

کرتے ہیں اور ان کی خواہشات کا خیال کرتے ہیں۔

س۔ کیا کبھی آپ بھی ایسی صورت سے دوچار ہوئے ہیں؟

ج۔ ہاں کئی بار۔ مثلاً جب میں نے یوسف ادریس کی کہانی "بیت من لحم" کا ترجمہ کیا تو ناشر نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ کلمۂ کور کے ترجمے کو میں بدل دوں۔ آپ جانتے ہیں کہ اس داستان کا ہیرو ایک اندھا قاری ہے۔

س۔ تو آپ ایسے کلمات کا ترجمہ کس طرح کرتے ہیں؟

ج۔ کور کی جگہ میں کہتا ہوں جو آنکھ سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ یہ صورت اگرچہ مضحکہ خیز ہے لیکن حقیقت ہے۔

س۔ دین، سیاست اور مسائل کے مواقع میں سنسر کی کیا نوعیت ہے۔

ج۔ کچھ کے لئے سنسر ہے۔ وہ کلمات جو پڑھنے والوں کے جذبات کو برانگیختہ کرتے ہوں ممنوع ہیں۔ سیاست و مذہب میں سنسر زیادہ اہم نہیں ہے۔ اگرچہ ہمیں مکمل آزادی نہیں ہے مثلاً شہنشاہ جاپان کے موضوع کو لیجئے۔ شہنشاہ کی بابت ہمیں لکھنے کی مکمل آزادی نہیں ہے۔ سنسر کا کچھ تجربہ ہمیں بھی ہے۔ لیکن یہ سنسر اس معنی میں نہیں ہے جس کا وجود سرزمین عرب میں ہے۔ جاپان کے مصنفین اب ایسی ممنوعات کو لائق اعتنا نہیں سمجھتے۔

س۔ کیا حکومت پر حملہ اور اس کی مذمت کی صورت میں جاپانی مصنف اسیر زندان ہوتے ہیں؟

ج۔ (مزاح کے انداز میں) اگر کوئی چوری کرتا ہے تو وہ قید خانہ ضرور جاتا ہے۔

س ۔ ایک عرب شناس کی حیثیت سے آپ کا ہدف کیا ہے ؟

ج ۔ اولاً میں چاہتا ہوں کہ اپنے نقطۂ نظر اور دلچسپی کے مطابق عرب کے داستانی ادبیات کے بہترین آثار کو جاپانی قارئین تک تراجم کی شکل میں منتقل کروں۔ اگر اس میں میری جانب سے کوتاہی ہوتی ہے تو گویا میں اپنے فرض کی انجام دہی میں کوتاہی کرتا ہوں ۔ میں ایک مخصوص نقطہ نظر سے اس کام کو انجام دیتا ہوں ۔ یہ خود اپنے اور دوسروں کے روبرو شمولیت کا مسئلہ ہے۔

کیا اسلام دہشت گردی کی تعلیم دیتا ہے؟

از کلیم صفات اصلاحی ٭

اس وقت ہمارے پیش نظر، ۱ دسمبر ۲۰۰۱ء کا امر اجالا ہے۔ اس میں ایک مضمون "آتنک واد (دہشت گردی) کی مانسکتا (ذہنیت) کو سمجھیں" کے عنوان سے شائع ہوا ہے اس کے مضمون نگار بھانو پرتاپ شُکل صاحب نے قرآنی آیتوں کی غلط تشریح و ترجمہ کرکے اسلام کو مجروح کرنے اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو سخت ٹھیس پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے خیال میں مذہب اسلام دہشت گردی کی تعلیم دیتا ہے اور اس کے متبعین دہشت گرد ہیں۔ دنیا کے بیشتر علاقوں بالخصوص جنوبی و مغربی ایشیا میں ان کی سرگرمیاں شباب پر ہیں، ہندوستان، افغانستان، چین، ملیشیا، انڈونیشیا، البانیہ، روس، امریکہ اور اسرائیل جیسے دنیا کے متمدن ممالک اس کی زد میں ہیں۔

یہ پورا مضمون اسلام سے ناواقفیت کا ثبوت ہے اور اس میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو ہرزہ سرائیاں کی گئی ہیں وہ وہی ہیں جو پہلے سے کی جاتی رہی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ پہلے اعتراض کرنے والے کسی قدر پڑھے لکھے ہوتے تھے مگر یہ مضمون، مضمون نگار کی جہالت، لاعلمی اور اسلام سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ یہ مضمون کسی طرح اس لائق نہ تھا کہ

٭ اسکالر ۔ دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

اس کا جواب دیا جاتا مگر اس میں کلام پاک کی بعض آیتوں کا توڑ مروڑ کر نہایت غلط مفہوم پیش کیا گیا ہے۔ اس لئے ہم کو اس کی جانب توجہ کرنا ضروری معلوم ہوا۔

مضمون نگار کو تو پہلے اس اہم اور بنیادی بات کا خیال رکھنا چاہئے تھا کہ

۱۔ کسی نظریہ یا مذہبی تعلیم کے اثبات کے لئے ضروری نہیں ہے کہ دوسرے مذاہب کے اصول و نظریات کی بالکلیہ تردید کی جائے۔

۲۔ کسی مذہب کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کے لئے یہ ضروری شرط ہے کہ اس مذہب کی بنیادی کتابوں کا براہ راست مطالعہ کیا جائے، یا پھر وہ لوگ جو اس مذہب کے بارے میں گہری واقفیت رکھتے ہوں ان کی کتابوں کو پڑھ کر اس کے بارے میں رائے قائم کی جائے۔ وہ متعصب اور مخالف لوگ جو خواہ مخواہ اعتراضات اور نکتہ چینیاں کرتے ہیں اور بدنیتی سے اس کی غلط تعبیر و تشریح کرتے ہیں، ان کو اپنا ماخذ نہ بنایا جائے۔

۳۔ قرآن مجید پر اظہار خیال کرنے سے پہلے عربی زبان پر دسترس اور اس کے انداز و اسلوب کی مزاج شناسی ضروری ہے۔ نیز یہ جاننا چاہئے کہ جن آیتوں کو وہ موضوع بحث بنا رہا ہے وہ کب اور کس موقع پر نازل ہوئیں؟ ان کا سیاق و سباق کیا ہے؟ اگر حدیث سے استدلال کیا جائے تو اس کا موقع و محل جاننا اور یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ روایت صحیح اور معتبر ہے کہ نہیں۔

۴۔ مضمون نگار کو دیانت دار اور غیر جانب دار ہونا چاہئے۔

لیکن افسوس ہے کہ امر اجالا کے مضمون نگار نے ان باتوں میں سے کسی کا بھی خیال نہیں رکھا ہے۔ اس لئے ان کے سارے اعتراضات بے سروپا ہیں۔

بھانو پرتاپ صاحب نے اسلام اور مسلمانوں کا رشتہ دہشت گردی سے جوڑنے

کے لئے قرآن پاک کی بعض آیتوں کا غلط ترجمہ کیا ہے۔ ان کے مضمون کے مجموعی جائزہ کے بعد حسب ذیل پانچ بے بنیاد باتیں سامنے آتی ہیں۔

۱۔ اسلام انسانیت کو دو حصوں میں بانٹتا ہے۔ کافر، مسلمان ۲۔ اسلام دہشت گردی کی تعلیم دیتا ہے ۳۔ اسلام کے عقیدت مند دہشت گرد ہیں ۴۔ اسلام کافروں سے دوستی کو منع کرتا ہے ۵۔ اسلام (قرآن و حدیث) کے کسی بھی جملہ پر بحث و تبصرہ کی اجازت نہیں دیتا۔

ان کا پہلا اعتراض اس لئے غلط ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب نے اپنے متبعین کو کسی نہ کسی نام سے موسوم کیا ہے۔ گوتم بدھ کے ماننے والے بدھسٹ، ہندو مت کے ماننے والے ہندو، عیسائیت کے پیروکار عیسائی (کرسچین)، یہودیت سے وابستہ یہودی، زرتشت کے عقیدت مند پارسی اور اسلام پر عمل کرنے والوں کو مسلمان کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اس بنا پر ناموں کی یہ تفریق انسانیت اور مانوتا کی تفریق پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ یہ امتیاز صرف شناخت اور پہچان کے لئے ہوتا ہے۔ البتہ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام نے اپنے پیروؤں کو مسلمان اور خدائے واحد کو نہ ماننے والوں کو کافر یا غیر مسلم کیوں کہا ہے؟

"اسلام کے لفظی معنی حوالہ کرنا" ہے اور اسلامی شریعت کی اصطلاح میں مسلمان ایسے شخص کو کہتے ہیں جو کلی طور پر اپنے آپ کو خدائے واحد کے حوالہ کردے۔ زبان سے اللہ کی وحدت اور رسول کی رسالت کا اقرار اور دل سے ان پر مہر تصدیق ثبت کردے۔ اس کے برخلاف "کفر" کے لغوی معنی چھپانا یا انکار کرنا ہے۔ کاشت کار زمین میں بیج کو چھپاتا ہے۔ اس لئے اسے بھی کافر کہا جاتا ہے۔ شریعت اسلامی کی اصطلاح میں "کافر ایسے فرد کو کہتے ہیں جو خدا کی وحدت اور رسول کی رسالت کا انکار کرتا ہے۔ کفر کی طرح اسلام کی نظر میں ایک بڑا جرم شرک بھی ہے، یعنی اللہ کی وحدت و یکتائی میں کسی کو شریک کرنا۔ اسلام ایسے

لوگوں کو مشرک کہتا ہے۔ لیکن اس بنیاد پر اسلام اپنے پیروؤں کو کافروں اور مشرکوں سے ممتاز نہیں کرتا کیونکہ وحدت الٰہ کی طرح وہ وحدت آدمؑ کی بھی تعلیم دیتا ہے کہ سارے انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں اور ان میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں یہ تو برہمنیت ہے جو اپنے علاوہ سب کو ہیچ سمجھتی ہے۔ اسلام ہرگز انسانیت کو دو ٹکڑوں میں نہیں بانٹتا، یہ اس پر سراسر اتہام ہے۔

شنکل صاحب نے بغیر کسی حوالے کے یہ گل افشانی کی ہے کہ مقدس قرآن میں ایمان والوں کو غیر ایمان والوں سے دوستی کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اگر کوئی مسلمان ایسا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد نہیں کرتا۔

دراصل مسلمانوں کے نزدیک قرآن مجید اللہ کا کلام ہے جس کو اس نے اپنے پیغمبر پر اتارا اور وحی کیا تھا۔ وحی کا یہ سلسلہ ایک دن، ایک ماہ یا ایک سال ہی تک جاری نہیں رہا بلکہ اس کے احکام و قوانین اور تعلیمات و ہدایات، حالات و ضروریات کے مطابق جستہ جستہ تیئس ۲۳ برس کے طویل عرصے میں نازل کئے گئے ہیں، اسی لئے قرآن مجید کی ہر سورہ اور ہر آیت کا ایک شان نزول ہوتا ہے، جس سے اگر واقفیت نہ ہو تو کسی آیت کا مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا، شان نزول کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آیت کب اور کس موقع پر یا کس پس منظر میں نازل ہوئی۔

بلاشبہ قرآن مجید کی بعض آیتوں میں کفار و مشرکین اور اہل کتاب سے دوستی کی ممانعت کی گئی ہے لیکن اس طرح کی ہدایات کسی خاص موقع و محل یا بعض مخصوص حالات و واقعات کے تحت دی گئی تھیں، چنانچہ اس مفہوم کی آیتیں زیادہ تر مدینہ کے ان منافقین کے ضمن میں نبی پر اتاری گئی ہیں جو خود کو دین اسلام کا پیرو کہتے تھے لیکن درپردہ دشمنان اسلام

سے مل کر اسلام کے خلاف سازشیں اور ریشہ دوانیاں کررہے تھے۔ اس لئے قرآن مجید نے ایسے لوگوں کے باب میں راسخ العقیدہ مسلمانوں کو حکم دیا کہ تم کو......

.......کفار و مشرکین کی

دوستی سے باز آجانا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کے سامنے ان ریاکار منافقین کا پردہ فاش کیا ہے اور سچے مسلمانوں کو ہدایت کی ہے کہ ایسے خطرناک دشمنان اسلام سے ساز باز رکھنا خدا کی مرضی و مشیت کے خلاف ہے۔ ظاہر ہے جن حالات میں یہ تعلیم مسلمانوں کو دی گئی تھی، ان میں نہ صرف قرآن مجید کی تعلیم ہونے کی بنا پر بلکہ از روئے عقل بھی یہی صحیح تھا کیونکہ ہر مذہب کے داعی و بانی کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ اپنی دعوت و مذہب کی حفاظت و بقا کے لئے اس کے ماننے والوں کو اس کے مخالفین سے میل جول اور دوستی و تعلقات قائم کرنے سے روک دے جو سازش اور منصوبہ کرکے اس کے مٹانے کے درپے ہوں، خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ مخالفین پروپیگنڈے کرکے اور غلط افواہیں پھیلا کر لوگوں کو اس کی دعوت سے منحرف کرنے کی کوششوں میں مصروف ہوں اور ان سے ہر آن جنگ کا خطرہ رہتا ہو۔

قرآن مجید کی بعض دوسری آیتوں سے بھی منافقین کی اعدائے اسلام کی مخالفانہ سرگرمیوں میں حصہ لینے کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ ان کی اس قلبی بیماری کا حال ایک آیت میں اس طرح بیان کرتا ہے۔ "تو ان لوگوں (منافقین) کو دیکھتا ہے جن کے دلوں میں مرض ہے وہ دوڑ کر ان (کافروں) سے ملتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ ہم پر کوئی گردش نہ آجائے"۔ تاہم جب اللہ کافروں کے مقابلے میں مسلمانوں کو فتح و نصرت سے ہمکنار کرتا ہے تو (منافقین غم زدہ ہو جاتے ہیں اور پچھتاتے ہیں) اس پر مسلمانوں کو تعجب ہوتا ہے

کہ کیا یہ وہی لوگ ہیں جو اسلام کی اعانت و ہمدردی کا دم بھرتے تھے اور اللہ کی پختہ قسمیں کھاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں (تو مسلمانوں کی کامیابی پر ان کا منھ کیوں لٹک گیا اور خوش ہونے کے بجائے ناخوش کیوں ہوتے ہیں)، ان کے اعمال برباد ہوگئے اور رہ گئے نقصان میں۔ (مائدہ ۵ : ۵۲)

اسی سورہ کی ایک دوسری آیت میں ایمان والوں کو اہل کتاب اور کفار کو اپنا دوست بنانے سے مسلمانوں کو محض اس لئے روکا گیا ہے کہ "وہ خدا کے دین کا مذاق اڑاتے تھے۔ (مائدہ ۵ : ۵۷)

سورۂ آل عمران کی ایک آیت میں غیر مسلموں کو اپنا ہمراز نہ بنانے کی تلقین اس لئے کی گئی ہے کہ وہ مسلمانوں کی خرابی میں کوئی کمی اور کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ بلکہ مسلمانوں کو جتنی (زیادہ) تکلیف پہنچے ان کو خوشی ہوتی ہے۔ (۳ : ۱۱۸)

مذکورہ بالا آیتوں سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو کن حالات میں کافروں یا غیر مسلموں سے موالات نہ کرنے اور اپنا رازدار بنانے سے روکا گیا ہے اور ان سے ترک تعلق کا اصل منشا کیا ہے؟ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کافر اور اہل کتاب ضعیف الایمان مسلمانوں سے خلا ملا رکھ کر مسلمانوں کے عزائم اور منصوبوں سے واقفیت حاصل کرتے تھے اس لئے مسلمانوں کو ان کی رفاقت اور دوستی سے روکا گیا ہے۔ ایسے کمزور اور ناپختہ مسلمانوں سے اس کا خطرہ بھی رہتا تھا کہ وہ کفار اور اہل کتاب کی صحبت و اختلاط کی وجہ سے رفتہ رفتہ ان ہی کا مذہب نہ اختیار کرلیں۔ ظاہر ہے کوئی مذہب بھی اس کو گوارا نہیں کرسکتا ہے کہ اس کے ماننے والے اس کے مخالفین سے دوستی کریں اور ان کی سازشوں کا شکار ہوں۔ علاوہ ازیں قرآن مجید نے جہاں بھی کفار کی دوستی سے منع کیا ہے وہاں اس کی

اصل وجہ بھی بتادی ہے اس لئے اگر اس کے سیاق و سباق کو پیش نظر رکھا جائے تو اعتراضات کے تمام دروازے خود بخود بند ہوجائیں گے۔ لیکن جن لوگوں کا مقصد اعتراض برائے اعتراض ہو وہ بھلا اس کی زحمت کیوں گوارا کریں گے کہ اصل حقائق کو جاننے اور معلوم کرنے کی کوشش کریں۔

گویا تحفظ حق اور اہل باطل کی ریشہ دوانیوں سے بچنے کی خاطر اہل باطل سے اس طرح کی محبت و دوستی سے اسلام مسلمانوں کو روکتا ہے لیکن جب اسلام کو غیر مسلموں کی فتنہ سامانیوں، سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے خطرہ نہ ہو تو ان سے دوستی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ سورۂ ممتحنہ میں اللہ کا ارشاد ہے:

"اللہ تم کو ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف سے نہیں روکتا جو تم سے دین کے معاملے میں لڑائی نہیں کرتے اور نہ تم کو تمہارے علاقوں (گھروں) سے نکالتے ہیں اللہ منصفوں سے محبت رکھتا ہے۔ وہ تم کو ان ہی کی دوستی سے منع کرتا ہے جو تم سے مذہب کے معاملے میں لڑائی کریں اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالیں اور تمہارے نکالنے پر ایک دوسرے کے مددگار بنیں۔ جو (لوگ) ان سے دوستی کرتے ہیں وہی ظالم ہیں۔" (۸، ۹)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید مسلمانوں کو ایسے کافروں کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنے کا حکم دیتا ہے جن کی طرف سے اسلام کو برباد کرنے کی کوششیں نہ ہو رہی ہوں۔ بلکہ ان سے روا دارانہ برتاؤ کی اسلام نے تحسین فرمائی ہے کیونکہ اسلام دنیا میں عدل و انصاف کے قیام کا خواستگار رہا ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ مسلمان ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں اور ان کو دکھا دیں کہ اسلامی اخلاق کا معیار کس قدر بلند ہے۔ اسلام کی تعلیم اس بات کی

بالکل اجازت نہیں دیتی کہ بے ضرر کافروں سے بغض و عداوت رکھی جائے۔ ایسا کرنا اسلام کی نظر میں حکمت و انصاف کے خلاف ہوگا اور اللہ ایسے غیر منصفوں کو ناپسند کرتا ہے، خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔

قرآن مجید کی اس واضح صراحت کے بعد بھی کون انصاف پسند یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ اسلام عام غیر مسلموں سے دوستانہ و برادرانہ روابط کی نفی کرتا ہے۔ شکل صاحب جیسے دیدہ دلیر اور ڈھیٹ لوگ ہی یہ کہنے کی جسارت کرسکتے ہیں لیکن ایسے لوگوں کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ جب بھی آتشِ باطل کی شعاعوں نے خرمنِ حق کو خاکستر کرنے کی کوشش کی ہے دنیا نے ان کو سرد ہوتے ہوئے ہی دیکھا ہے۔

شکل صاحب نے سورۂ انفال کی بارہویں آیت کا غلط سلط ترجمہ کرکے لکھا ہے کہ "یہ آیت ایمان والوں کو یہ نردیش (پیغام) دیتی ہے کہ غیر ایمان والوں کو سماپت (ختم) کردینا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ایشور (اللہ) نے اپنے دوت (پیغمبر) سے کہا کہ تم ایمان والوں کو یہ سندیش (پیغام) دو کہ وہ (ایشور) ایمان والوں کے ہی ساتھ ہے۔ ایمان والوں کو سشکت (ثابت قدم رکھو) کرو، وہ (اللہ) غیر ایمان والوں کے ہردے (دل) میں بھے (ڈر، رعب) بھر دیں گے۔ تم ایمان والے) ان (غیر ایمان والوں) کے گلے کاٹ ڈالو اور ان کی انگلیاں کاٹ ڈالو"۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی روایت اور اس کے اصولوں میں کچھ حصے ایسے ضرور ہیں جو دہشت گردوں کے لئے مشعل راہ ہیں"۔

شکل صاحب کا یہ ترجمہ طبع زاد اور حقیقت ناشناسی کا ثبوت ہے۔ اگر انہوں نے آیت کے سیاق و سباق پر غور کرنے کی ضرورت محسوس کی ہوتی تو انہیں اس کا جواب خود ہی مل جاتا اور وہ اس طرح کی بے سروپا بات نہ لکھتے۔ ان کی علمی بد دیانتی کا اندازہ ان کے

ترجمہ ہی سے ہوجاتا ہے۔ انہوں نے لفظ "ملائکہ" کا ترجمہ دوت (پیغمبر) کیا ہے اور اس سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مراد لیا ہے۔ حالانکہ درحقیقت اس آیت میں اللہ کی اپنے دوت سے ہم کلامی یا تخاطب کی بات مذکور نہیں ہے بلکہ اس میں ملائکہ یعنی فرشتوں سے خطاب کیا گیا ہے، شکل صاحب کے اخذ و استنباط کا حال ملاحظہ ہو کہ انہوں نے لفظ دوت جس کا اطلاق پیغمبر یا قاصد پر ہوتا ہے اور اسی لئے سرکاری سفیروں کو ہندی زبان میں "راج دوت" کہتے ہیں، انہوں نے اس کا اطلاق فرشتوں پر کردیا ہے اس وقت ہمارے پیش نظر قرآن مجید کے دو ہندی ترجمے ہیں ان میں سے کسی مترجم نے اس کا ترجمہ دوت نہیں کیا ہے۔

ہمارے خیال میں لفظ دوت کا اطلاق صرف انہیں قاصدوں پر ہوتا ہے جن کا تعلق انسانی مخلوق سے ہے، غیر مرئی ہستیوں (قاصدوں) کے لئے اس کا استعمال ہندی، اردو اور عربی کسی بھی زبان میں نہیں کیا گیا ہے۔ ہندی ڈکشنری میں بھی دوت فرشتوں کے معنی میں نہیں ہے۔ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق ملائکہ (فرشتے) اللہ کی نورانی مخلوق ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ اپنی مرضی کے مطابق اپنے احکام نبیوں کے پاس بھیجتا ہے، لہٰذا زیر بحث آیت میں لفظ "ملائکہ" کی تعبیر کے لئے دوت کا استعمال قطعاً درست نہیں ہے اور اس کا انتساب حضورؐ کی طرف اور بھی بے بنیاد ہے۔

جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ قرآن مجید کی آیتوں اور سورتوں کا پس منظر و پیش منظر (شان نزول) ہوتا ہے جس سے واقفیت قرآن مجید کے طالب علم کے لئے ضروری ہے، مگر شکل صاحب کو نہ تو اس سے واقفیت ہے اور نہ تو وہ واقفیت حاصل کرنے کے لئے زحمت کرنا چاہتے ہیں اس لئے وہ آیت کا مطلب کچھ کا کچھ بنادیتے ہیں۔ اس لئے ہم قدرے تفصیل سے ان کی غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہیں۔

درحقیقت یہ سورہ ۲ھ میں جنگ بدر کے بعد نازل ہوئی، مکہ میں جب کفار و مشرکین نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کردیا اور تبلیغ اسلام کی راہیں ہر طرف سے مسدود کی جانے لگیں تو اللہ نے مسلمانوں کو نقلِ مکانی (ہجرت) کا حکم دیا چنانچہ کچھ مسلمان حبشہ ہجرت کر گئے پھر سرورِ کائناتؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ مدینہ میں انصاریوں نے آپ کی مدد فرمائی، چند ہی روز بعد قریش (کفار مکہ) نے انصار کو خط لکھا کہ تم نے ہمارے آدمیوں (دشمنوں) کو پناہ دی ہے، تم یا تو ان کو قتل کردو یا انہیں مدینہ سے نکال دو، ورنہ ہم سب تم پر حملہ کر کے تمہیں فنا کردیں گے، لیکن چونکہ انصار سچے مسلمان تھے اور انہوں نے حضورؐ کی اعانت کا وعدہ کیا تھا اس لئے ان پر قریش کے اس وعید آمیز خط کا کوئی اثر نہیں ہوا اور انہوں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اس کے بعد قریش (کفار مکہ) نے بعض مہمیں روانہ کیں لیکن اس کا بھی قریش کو خاطر خواہ فائدہ نہ حاصل ہوا، تب ۲ھ میں بدر کے مقام پر یہ جنگ ہوئی جو کافروں اور مسلمانوں کے درمیان پہلی باقاعدہ جنگ تھی جس میں مسلمان قلتِ تعداد اور بے سروسامانی کے باوجود ۳۱۳ کی تعداد میں جانفروشانِ اسلام کے مدمقابل ایک ہزار کفار قریش کے لشکر جرار پر جو پوری طرح مسلح تھا خدا کی مدد سے غالب آئے۔ سورۂ انفال میں کفر و اسلام کی اسی جنگ پر مفصل تبصرہ ہے اس میں اللہ نے اس فضل و احسان کا ذکر کیا ہے جو اس نے اس موقع پر اپنے مومن بندوں پر فرمایا تھا۔ اسی سلسلۂ بیان میں اللہ اپنی نصرت و مدد کا ذکر کرتا ہے تاکہ مسلمانوں کے جوشِ ایمان میں اضافہ ہو۔ اس سیاق و سباق میں آیت زیر بحث کا صحیح توضیحی ترجمہ ملاحظہ ہو:-

"یاد کرو اس وقت کو جب (جنگ بدر میں) خدا فرشتوں کو حکم دے رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تم مسلمانوں کو ثابت قدم رکھو (یعنی کفار کی تین گنی مسلح فوجوں کو دیکھ کر

مسلمان نہ گھبرائیں، ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئے) میں کافروں (جو میرے دین کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں) کے دل میں رعب ڈال دوں گا (یعنی ان کی کثیر تعداد سے تم خائف نہ ہو، میری طاقت اور میرے جبروت و جلال کا ان کافروں کو اندازہ نہیں ہے۔ میں ان کے ذہن و دماغ میں اپنا ایسا خوف ڈال دوں گا جس سے ان کے حوصلے پست ہو جائیں گے) سو تم ان کی گردنوں پر مارو اور ان کے پور پور (جوڑ جوڑ) پر مارو۔ کیونکہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے اور اللہ ان کو (ان کی مخالفت اور دشمنی کی وجہ سے) سخت عذاب دے گا۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس آیت میں اس تائیدِ غیبی اور امدادِ ربانی کا ذکر ہے جو اللہ نے جنگ بدر میں فرشتے بھیج کر مسلمانوں کو کی تھی۔

اگر شُکل صاحب اور ان جیسے معترضین غیر جانب داری اور حق طلبی کی نیت سے اسلام اور قرآن مجید کا مطالعہ کریں تو انہیں اس طرح کے بے سروپا اور مضحکہ خیز اعتراض کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ اخلاق، اسلام کی تعلیم کا ایک اہم جز ہے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے اہم مقاصد میں تھا۔ آپ کی تربیت سے صحابہ کرام محاسنِ اخلاق سے آراستہ ہو کر ذمائم اور رذائل سے نفرت کرنے لگے تھے، یہی ہر اچھے مسلمان کی پہچان ہے کہ وہ اچھے اخلاق اور پاکیزہ اوصاف کا نمونہ ہوتا ہے اور ہر طرح کے فواحش اور رذائل سے اجتناب کرتا ہے، اس لئے اسلام کا سچا پیرو دہشت گرد نہیں ہو سکتا۔

دراصل کسی انسان کی جان، مال، عزت و آبرو پر حملہ کرنا دہشت گردی ہے اور دہشت گردوں کا تعلق کسی مذہب سے نہیں ہوتا۔ اس کو تحقیق کے بغیر مسلمانوں یا کسی مذہبی فرقہ کی طرف منسوب کرنا بددیانتی، جرم اور بذاتِ خود دہشت گردانہ عمل ہے چنانچہ

ہیروشیما ناگاساکی پر ایٹمی حملہ، واشنگٹن، کشمیر کی اسمبلی، ہندوستان کی پارلیمنٹ اور اڑیسہ اسمبلی پر حملہ دہشت گردانہ کارروائی ہے لیکن کشمیر و اڑیسہ کی اسمبلیوں اور ہندوستان کی پارلیمنٹ پر حملہ کا مسئلہ تحقیق طلب ہے کہ ان کے پیچھے کس طرح کی شیطانی سازشوں اور عیارانہ طاقتوں کا ہاتھ ہے۔

دہشت گردی کے سلسلے میں اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ وہ پیدا کیونکر ہوئی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب کسی گروہ اور جماعت کے جائز مطالبات پورے نہ کئے جائیں گے اور اس کی مسلسل حق تلفی کی جائے گی تو وہ لامحالہ اس طرح کی کارروائیوں کے لئے مجبور ہوجاتا ہے چنانچہ اس کا انسداد اسی وقت ممکن ہے جب اس طرح کی کارروائیوں کے مثبت پہلوؤں پر غور کیا جائے اسی لئے اس معاملہ میں اسلام کی تعلیم یہ ہے:

" وَاٰتُوا کل ذی حق حقہ یعنی ہر صاحب حق کو اس کا حق دو"۔

اسلام کے اس اصول سے دہشت گردی کی جڑ ہی ختم ہوجاتی ہے۔

اب سنجیدہ غیر مسلم حضرات اور غیر جانب دار یورپین اہل قلم بھی یہ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ اسلام کوئی جنگ جو یا دہشت گرد مذہب نہیں ہے اور نہ وہ دہشت گردی کی تعلیم دیتا ہے، چنانچہ ہفت روزہ "ٹائم" یکم اکتوبر ۲۰۰۲ء میں آرام سٹرانگ کا ایک مضمون "اسلام کا حقیقی پر امن چہرہ" کے عنوان سے شایع ہوا ہے جس میں اس نقطہ نظر کی تردید کی گئی ہے کہ اسلام تشدد پسند دین ہے، مضمون نگار نے لکھا ہے کہ اسلام میں اگر ان واقعات کے لئے کوئی دلیل ہوتی جو ۱۱ ستمبر کو پیش آئے تو اسلام کبھی دنیا کا سب سے تیزی سے پھیلنے والا مذہب نہ ہوتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو عربوں جیسی وحشی اور جنگ جو قوم کو اس فضا سے نکال کر امن اور بھائی چارہ کا درس دیا۔ اگر انہوں نے کبھی جنگ لڑی بھی تو اسی وقت جب انہیں مجبور کیا گیا۔ اس نے لکھا ہے کہ اسلام آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت کا اصول مانتا ہے جو توریت میں بھی بیان ہوا ہے لیکن اگر کوئی معاف کردینے والا ہو تو قرآن مجید اس کو زیادہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے (بحوالہ اشراق، ص ۵۱، نومبر ۲۰۰۱ء)

معارف کی ڈاک

جناب عبداللطیف اعظمی کی وفات

محب معظم صانکم اللہ
سلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آج ہی کو لکھنؤ کے ایک اردو روزنامے میں رضا لائبریری رامپور میں منعقدہ ایک تعزیتی جلسے کی کارروائی نظر سے گزری، اس میں تین ادیبوں کی وفات پر اظہار غم والم کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک نام محب محترم عبداللطیف اعظمی صاحب مرحوم کا بھی ہے۔ ان کے ایسے مستند دانشور کے فقدان کا جو صدمہ ہوا وہ اپنی جگہ پر ہے۔ اس کا ملال مستزاد ہے کہ وہ بہت چپ چپاتے رخصت کر دئے گئے۔ ریڈیو پر بھی یہ خبر اذیت اثر سننے کو ملی لکھنؤ کے ان تین اردو اخباروں میں نظر سے گزری جو ہمارے یہاں آتے ہیں۔

مرحوم جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انتظامی عملے میں تھے لیکن تعلیمی دور سے لے کر سبکدوشی کے بعد تک مرحوم کا قلم گل افشاں رہا۔ مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے دفاع میں ان کا جہاد اور ماہنامہ جامعہ کے احیا میں ان کی سعی مشکور۔ ان کے عدیم النظیر تاریخی کارنامے ہیں۔

مرحوم سے ملاقات کے موقع تو بس تین چار بار آئے مگر خط وکتابت کافی رہی۔ آخر میں میرے کسی فقرے سے بددل ہوکر مراسلت کا سلسلہ قطع کردیا تھا، پھر بھی کسی بات کے سلسلے میں ہیچمدان کے معلومات جاننا چاہتے تھے تو یاد فرمایا تھا۔

مجھے نہایت خوش اخلاق، مہمان نواز اور کریم النفس انسان لگے۔ ان سے آخری ملاقات جب ہوئی تو برادرم ضیاء الحسن فاروقی صاحب بھی وہیں تشریف فرما تھے۔ یہ ملاقات ان دونوں حضرات سے آخری تھی۔ افسوس کہ وہ نسل بھی اب اٹھتی جارہی ہے جس نے بزرگان پیشیں کو دیکھا اور ادراک کیا تھا، میں ان دونوں کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہوں۔

فقط والسلام

سبط محمد نقوی

وفیات

ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی

از

پروفیسر سید عبدالرحیم *

"ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی ملک کے مایہ ناز فاضل، ماہر کتبہ شناس اور دارالمصنفین کے بڑے قدرداں تھے، ان پر گذشتہ اشاعت میں ایک تعزیتی تحریر شائع ہو چکی ہے، پروفیسر سید عبدالرحیم ڈاکٹر صاحب مرحوم کے رفیق اور معتمد علیہ تھے، ان کا یہ مضمون مفصل ہے جو ان کے شکریے کے ساتھ معارف میں شائع کیا جاتا ہے"۔ (ض)

گجرات پچھلے دو ماہ سے فسادات کی آگ میں جل رہا ہے، سیکڑوں معصوم جانیں نذر آتش ہو گئیں، ایسے ہی پرآشوب دور میں ایک اور عظیم سانحہ علم و ادب کی دنیا میں رونما ہوا اور وہ گجرات کی ایک بلند پایہ علمی شخصیت ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی سابق ڈائرکٹر محکمہ آثار قدیمہ کے سانحہ ارتحال کا ہے، ۲۴ مارچ ۲۰۰۲ء کی دوپہر کو ڈاکٹر صاحب نے خورشید پارک احمد آباد میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

علالت و وفات | گجرات کے حالیہ فسادات کے دوران وہ زیادہ بیمار ہو گئے تھے، انہیں قلب کا عارضہ تو پہلے ہی سے تھا اسی کے ساتھ کئی بیماریاں لاحق ہو گئی تھیں۔

* پلاٹ نمبر ا، فردوس کالونی، پانڈے گارڈن، نیر جعفر نگر، ناگ پور۔

موصوف کو ایک خانگی دواخانہ کرناوتی میں داخل کیا گیا تھا، شہر میں کرفیو چل رہا تھا اس وجہ سے گھر کے لوگ بھی کما حقہ تیمارداری کے لئے نہیں پہنچ سکے۔ بالآخر ڈاکٹر ہی کے مشورے سے انہیں گھر پر منتقل کر دیا گیا۔ سانس لینے میں تکلیف ہو رہی تھی جس کی وجہ گھر پر آکسیجن لگانا پڑتا تھا۔ ڈاکٹر ڈیسائی صاحب کے قیام گاہ کے قریب پروفیسر محبوب حسین صاحب عباسی کا مکان ہے وہ ان کے آخری ایام کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"ہمارے سرخیز کے علاقے میں ۲۱-۲۲ مارچ کی شب میں بڑا ہنگامہ ہوا اور کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ میں ڈیسائی صاحب سے آخری بار ۲۱ تاریخ کی صبح ملا تو آکسیجن لگا ہوا تھا پھر بھی اچھی طرح بات چیت کی۔ کچھ وقت پہلے امریکہ کے Prof. Dr. JOHN SEYLLER کے ایک مقالہ پر نوٹس لکھے تھے اس کی کاپی مجھے دی اور امریکہ روانہ کرنے کے لئے کہا، ان کا پتہ خود انہوں نے ڈائری سے تلاش کر کے مجھے لکھوایا، اس وقت بھی ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ اتنی جلد آخری وقت آجائے گا۔ ۲۴ مارچ کو سخت کرفیو تھا میں دوپہر ڈیڑھ بجے گھر پر ہی ظہر کی نماز ادا کر رہا تھا کہ ڈیسائی صاحب کے بھتیجے ایک شناسا ڈاکٹر محسن حسنی کو لے کر ڈیسائی صاحب کے مکان پر جاتے ہوئے میرے یہاں آئے اور دروازے پر خبر دے گئے کہ حالت نازک ہے، نماز سے فارغ ہوا ہی تھا کہ ڈیسائی صاحب کے لڑکے طارق کا فون آیا اور انتقال کی خبر دی اب باہر تو کرفیو تھا، بڑی سڑک پر تو جا نہیں سکتے تھے لہذا ہماری سوسائٹی کے پیچھے ایک کچے راستے سے خورشید پارک کے عقب میں پہنچا اور ایک پلاٹ کی کمپاؤنڈ کی دیوار پر چڑھ کر وہاں داخل ہو سکا، کرفیو کی وجہ سے خورشید پارک کے رہنے

والوں میں سے چند لوگ آگئے تھے فوراً غسال کو طلب کیا اور چار بجے تک غسل اور کفن سے فارغ ہو کر جنازہ تیار کر لیا گیا، اس وقت مسجد کے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ اعلان کیا گیا تو قریب کی سوسائٹیوں سے تقریباً ۵۰ افراد جمع ہو گئے، پونے پانچ بجے مسجد کے صحن میں نماز جنازہ ادا کی گئی، امامت کی ذمہ داری بھی مجھ پہ ڈالی گئی، جنازے کو ایک ٹرک میں رکھا گیا، کچھ لوگ ساتھ ہی سوار ہو گئے، پولس نے اجازت دی تھی اس لئے سہولت کے ساتھ جوہاپورہ کے عام قبرستان میں تدفین ہوئی، قریب ساڑھے پانچ بجے فارغ ہو گئے،،۔

ڈاکٹر صاحب کی موت علمی دنیا کے لئے ایک عظیم سانحہ ہے، وہ نہ صرف ایک ماہر کتبہ شناس، سکہ شناس، تاریخ داں، محقق، مترجم، عہد اسلامی کے فن تعمیر کے رمز شناس، علوم دینیہ اور مرکز اسلامیہ کی تاریخ کے واقف کار بلکہ ہندوستان اور بیرون ہند کے کتب خانوں کے مخطوطات پر گہری نظر رکھنے والے اور فہرست ساز تھے ایسی علمی و ادبی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ راقم الحروف کو چالیس سال سے ان کی شاگردی اور رفاقت کا شرف حاصل ہے، میں نے اپنی مختصر زندگی میں ان سے زیادہ محنتی، فرض شناس، علم دوست اور فنافی العلم شخص نہیں دیکھا۔

پیدائش اور تعلیم ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی ۱؍مئی ۱۹۲۵ء میں دھندوکا میں پیدا ہوئے جو احمد آباد کے مضافات میں ایک قصبہ ہے، وہ بہت ذہین طالب علم تھے، اسکول اور کالج میں ہر جماعت میں اول نمبر کامیاب ہونے پر انہیں گورنمنٹ میرٹ اسکالر شپس ملتی رہیں، ۱۹۴۶ء میں بمبئی یونیورسٹی سے بی۔ اے (آنارس) کی ڈگری حاصل کی اور پوری یونیورسٹی میں امتیازی حیثیت حاصل کرنے پر آر۔ ایچ۔ مودی

پرائز حاصل کیا۔ ۱۹۴۸ء میں اسی یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور یونیورسٹی میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے پر چانسلر میڈل اور جعفر قاسم موسیٰ میڈل حاصل کئے۔

ملازمت ۱۹۴۷ء میں ان کا تقرر فارسی کے لکچرر کی حیثیت سے ہوا۔ احمد آباد بمبئی اور راج کوٹ میں لکچرر رہے ۱۹۵۳ء میں آثار قدیمہ ہند دہلی کے فارسی عربی کتبہ شناسی کے شعبہ میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے، ۱۹۵۸ء میں فارسی عربی کتبہ شناسی کا دفتر دہلی سے ناگپور منتقل ہو گیا۔ ۱۹۶۰ء میں وہ سپرنٹنڈنگ ایپی گرافسٹ اور ۱۹۷۷ء میں ڈائرکٹر بنا دئے گئے اور ۱۹۸۳ء میں اسی عہدے سے وظیفہ یاب ہوئے۔ وظیفہ پانے کے بعد ڈاکٹر صاحب ۱۹۹۲ء تک انڈین کونسل فار ہسٹاریکل ریسرچ نئی دہلی کے سینئر ریسرچ فیلو اور ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۸ء تک امریکن انسٹی ٹیوٹ آف انڈین اسٹڈیز نئی دہلی کے جائنٹ چیف کالوبوریٹر رہے محکمۂ آثار قدیمہ ہند کی ملازمت کے دوران ۱۹۵۷ء میں حکومت کی جانب سے ایران بھیجے گئے، جہاں ایک سال قیام کیا اور فیضی کی نل دمن پر تحقیقی مقالہ پیش کر کے تہران یونیورسٹی سے فارسی میں ڈی لٹ کی ڈگری تحسین کے ساتھ حاصل کی۔

اعزازات (۱) ایپی گرافیکل سوسائٹی آف انڈیا کی جانب سے ۱۹۸۲ء میں ان کو سرٹیفکٹ آف آنرز "تامر پتر" دیا گیا۔

(۲) فارسی کی مسلمہ قابلیت اور خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے ۱۹۸۳ء میں صدارتی ایوارڈ دیا۔

(۳) ۱۹۸۳ء میں ڈاکٹر آئی بی تیسی توری گولڈ میڈل ملا۔

(۴) ۱۹۹۳ء میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی جانب سے سرجدوناتھ سرکار گولڈ میڈل دیا گیا۔

(۵) ۱۹۹۳ء میں وودورہ سے سنسکار ایوارڈ ملا۔

(۶) ۱۹۹۵ء میں گجرات اردو اکادمی کا ایوارڈ ملا۔

(۷) ۱۹۹۹ء میں تحقیقی و تنقیدی خدمات کے اعتراف میں ایوان غالب دہلی کی جانب سے فخر الدین علی احمد ایوارڈ دیا گیا۔

اسفار ملازمت کے دوران اور وظیفہ پانے کے بعد وہ حکومت ہند کی جانب سے اس کے نمائندہ کی حیثیت سے روس، امریکہ، عراق، افغانستان، پاکستان اور بنگلہ دیش تشریف لے گئے، ہند و بیرون ہند کی مختلف کمیٹیوں کے وہ رکن رہے ہیں۔

علمی خدمات اور تصنیفات انگریزی زبان پر ڈاکٹر صاحب کو بڑی قدرت حاصل تھی اس لئے ان کی بیشتر تصنیفات اور مضامین انگریزی میں شائع ہوئے ہیں۔ انگریزی کے علاوہ اردو، ہندی، گجراتی اور فارسی میں بھی آپ کے مضامین موقر رسائل میں شائع ہوئے۔ چونکہ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اس وجہ سے ان کے مضامین اور کتابوں میں بے شمار حوالہ جاتی نوٹس نظر آتے ہیں۔ جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کا حق ادا کر دیا۔ میں اولاً ان مضامین کی فہرست درج کرتا ہوں جو اردو میں لکھے گئے ہیں۔ بعض مضامین ان میں بہت طویل ہیں، انہیں یک جا شائع کیا جائے تو دو جلدیں مرتب کی جاسکتی ہیں۔

(۱) گفتار ملک محمود گجراتی۔ نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۵۵ء۔

(۲) شغل طوبی۔ نوائے ادب بمبئی، اکتوبر ۱۹۵۵ء۔

(۳) کچھ دیوان قاسم مینجا کے متعلق۔ مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ، دسمبر ۱۹۶۳ء

(۴) خیر المجالس اور گجرات۔ خلیق احمد نظامی میموریل والیوم علی گڑھ۔

(۵) اکبر کا بعد از مرگ لقب عرش آشیانی یا عرش آستانی۔ نذر مختار، نئی دہلی ۱۹۸۸ء۔

(۶) سترہویں صدی کے آگرہ کے ایک عارف و خطاط شاعر میر عبداللہ مشکیں قلم۔ معارف اعظم گڈھ ۱۹۹۱ء۔

(۷) مہریں ترقیمے عرض دیدے اور یادداشتیں۔ خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ ۱۹۹۸ء

(۸) ہندوستانی آثار قدیمہ۔ تحریر دہلی ۱۹۷۲ء۔

(۹) غالب کے منظوم کتبے۔ غالب نامہ نئی دہلی ۱۹۸۶ء

(۱۰) ہندوستان کے عہد اسلامی کے سکے۔ تحریر دہلی، جنوری مارچ ۱۹۷۵ء۔

(۱۱) دسویں صدی ہجری کا ایک اردو کتبہ۔ تحریر دہلی ۱۹۶۷ء۔

(۱۲) بارہویں صدی ہجری کی ایک دکنی نظم۔ تحریر دہلی ۱۹۶۸ء۔

(۱۳) شعراء کے سنین وفات۔ استدراک۔ تحریر دہلی ۱۹۷۷ء۔

(۱۴) وودرہ کی تاریخی عمارتیں۔ تذکرہ مشاہیر برار، حیدرآباد ۱۹۸۲ء۔

(۱۵) غالب کے دو معاصر۔ غالب نامہ ۱۹۸۴ء۔

(۱۶) دبستان شیرانی کا ایک محقق۔ سابرنامہ احمد آباد ۱۹۹۰ء۔

(۱۷) خان خاناں اور عرفی کی مکاتبت کا ایک صفحہ۔ مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ دسمبر ۱۹۶۳ء۔

"آثار قدیمہ ہند" (اے گوش کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ)

"تقویم ہجری وعیسوی" انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کے زیر اہتمام شائع شدہ تقویم ہجری وعیسوی کی تالیف میں ڈاکٹر صاحب نے نمایاں حصہ لیا۔ چنانچہ ابوالنصر خالدی صاحب اور مولوی محمود احمد خاں صاحب کے ساتھ مرتبین تقویم میں ان کا نام بھی شامل ہے۔

"عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست"۔ حضرت پیر محمد شاہ درگاہ شریف احمد آباد کے کتب خانے کے مخطوطات کی فہرست ان کی نگرانی اور سرپرستی میں شائع ہوئیں۔ اس فہرست کی چھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

ہندوستان کی مسجدیں۔

انگریزی زبان میں لکھی ہوئی تصنیفات کی فہرست درج ذیل ہے:

(1) Mosques of India : New Delhi 1967, 1971, 1980

اس کتاب کا اردو ترجمہ "ہندوستان کی مسجدیں" شائع ہو گیا ہے۔

(2)Centres of Islmaic learning in India. New Delhi- 1979

اس کتاب کا ہندی ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

(3) Indo Islamic Architecture, New Delhi, 1977, 1986

(4) Published Muslim Inscriptions of Rajasthan, Jaipur, 1971

(5) Life and works of Faidi - Calcutta 1961

(6) Corpus of Inscriptions stored in the Museum of Gujarat. 1987

(7) Catalogue of Muslim Gold Coins stored in the Baroda Museum and Picture Gallery, Vadodara - 1995.

(8) Taj Mahal (in joint authorship with H.K. Kaul) 1982.

(9) Perso-Arabic Epigraphy of Gujarat M.S.Univrersity Baroda- 1982

(10) Daftar Vidya (Archival science in Gujarati, Ahmedabad) 1986

(11) A Topographical list of Arabic Persian and Urdu Inscriptions of south India, New Delhi - 1989

(12) Fatehpur Sikri, Source Book (Co-author) Combrîdge Mass, U.S.A. 1985

(13) Muslim Monumental Calligraphy of India (Collaboration) Lowa, city U.S.A. 1985

(14) Shah Jahan Nama of Inayat Khan English Translation, revised and edited (in collaboration with Dr. W.E.Begley) Lowa city, U.S.A. our New Delhi - 1989

(15) Taj Mahal : An Illumined Tomb (in Collaboration with Dr.W.E.Begley) Washington D.C. U.S.A. 1990

(16) Malfuz Literature as a source for the 13th - 14th Century History of Rajasthan and Gujarat Patna,

(17)English Translation of Dhakhiratul Khawanin of Shaikh Farid BhaKKari, Part-I New Delhi-1992 (Part II and III Unpublished)

(18) Arabic and Persian Mahuscripts in The khuda Baksh Library, Vol.I Corrections and Additions, Patna, 1995

(19) Arabic Persian and Urdu Inscriptions of Western India Topographical List, New Delhi- 1999

(20) Catalogue of Paintings Albums and Illustrated Manuscripts in the Reza Library , Rampur - New Delhi - 2001

(21) Catalogue for the Specimen of Islamic Calligraphy in Sarabhai Foundation Museum, Ahmedabad.

(22) History of Shah Jahan Vol. I - III in joint authorship with Prof. Dr. W.E.Begley.

محکمہ آثار قدیمہ ہند کے سرکاری مجلہ Epigraphia Indica, Arabic and Persian Supplient کے ڈاکٹر صاحب ایڈیٹر رہے۔ ان کی ایڈیٹر شپ میں اکیس شمارے شائع ہوئے۔ ان میں سب سے زیادہ مضامین ڈاکٹر صاحب ہی کے نظر آتے ہیں۔ ہندوستان اور بیرون ہند کے رسائل میں اب تک تقریباً ۲۵۰ تحقیقی مضامین چھپ چکے ہیں۔

اخلاق و عادات

ایمانداری، خلوص، خوف خدا، سچائی، پاس نفس، بے نفسی، پاکبازی، غیرت اسلامی، بے خوفی، حق گوئی، محنت، لگن اور نہ جانے کتنے صفاتی اور کمالاتی جواہر ڈاکٹر صاحب کی سیرت میں تابندہ نظر آتے تھے۔ صحبت ناجنس سے گریز، علمی و تحقیقی کاموں میں انہماک، پے در پے اسفار اور کم آمیزی نے آپ کو بالکلیہ یک سو کر رکھا تھا۔ وہ زندگی کے ایک ایک لمحے کی قدر و قیمت جانتے تھے۔ ان کے نزدیک کام کا انعام و اعزاز صرف کام ہے، قدر دانی صلہ و ستائش محض اضافی چیزیں ہیں۔ پاکستان میں ڈاکٹر صاحب کا مختصر قیام رہا۔ وہاں کے ایک متبحر عالم پیر حسام الدین راشدی صاحب سے ملاقات ہوئی جو تقریباً پچاس کتابوں کے مصنف ہیں، راشدی صاحب نے مالک رام صاحب کو ڈاکٹر صاحب سے اپنی ملاقات کا حال لکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے متعلق لکھا کہ "ایک عرصے کے بعد ایک فنا فی العلم شخص سے ملاقات ہوئی"۔ پروفیسر نورالحسن، پروفیسر خلیق احمد نظامی اور ہارون خاں شیروانی ان کی تاریخ دانی کے بے حد مداح تھے۔ ڈاکٹر صاحب جن ادیبوں اور اہل علم حضرات سے بالخصوص متاثر تھے ان میں قاضی عبدالودود صاحب، ڈاکٹر نذیر احمد صاحب، حافظ محمود خاں شیرانی، پروفیسر محمد ابراہیم ڈار صاحب اور پروفیسر نجیب

اشرف ندوی صاحب قابل ذکر ہیں۔ علماء میں مولانا ابوالوفا افغانی، مولانا حبیب الرحمن اعظمی اور حضرت سید ابوالحسن علی ندوی مرحوم کی بہت تعریف کرتے۔ ڈاکٹر صاحب کو اللہ تعالیٰ نے حج کی سعادت بھی نصیب فرمائی تھی۔ نماز کے بہت پابند تھے۔ بیماری کی حالت میں بھی بیٹھ کر اور اشاروں سے نماز ادا کرتے۔ وہ اپنی زندگی میں کئی بڑے حادثوں (ACCIDENT) سے دوچار ہوئے، ان حادثوں کا موصوف نے نہایت صبر و شکر کے ساتھ استقبال کیا، گویا قدرت بھی چاہتی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کچھ تو آرام کریں، لیکن اسپتال میں پڑے پڑے بھی وہ اپنے علمی کاموں میں مشغول رہے۔ وہ نام و نمود سے بیزار تھے۔ موت کے وقت بھی ان کا یہ جذبہ کام آیا کہ شہر میں کرفیو تھا۔ گجرات میں کئی دفعہ فسادات ہوئے۔ مسلمانوں کی زبوں حالی دیکھ کر بہت افسوس کرتے۔ ایک موقع پر مجھے لکھا کہ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے لکھنا پڑھنا بند کر دیا ہو۔ لیکن حالیہ فسادات سے میں اتنا متاثر ہوں کہ دو ماہ ہو گئے نہ کچھ لکھا اور نہ پڑھا۔

عظیم شخصیتیں بھی کمزوریوں سے مبرا نہیں ہوتیں۔ یہ لازمہ بشریت ہے۔ ڈاکٹر صاحب مزاجاً "سخت گو اور سخت گیر تھے۔ جو بات نرمی سے کہی جا سکتی تھی اور اس کا حل آسانی سے نکل سکتا تھا اسے بھی وہ سخت لہجے میں کہتے۔ جس کے نتیجے میں ماحول کی فضا مکدر ہو جاتی۔ جو لوگ ان کے مزاج سے واقف تھے وہ تو کچھ برا نہیں مانتے، لیکن نئے لوگ ان سے دور ہو جاتے۔ برخلاف اس کے ان کا دل بالکل پاک تھا۔ فوراً ان کو احساس ہو جاتا اور وہ معافی

مانگ لیتے۔

۱۴ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو درگاہ حضرت پیر محمد شاہ ریسرچ سنٹر احمد آباد کے سمینار میں شرکت کا موقع ملا۔ اس وقت وہ بیماریوں کی وجہ سے بالکل لاغر ہوگئے تھے اور مزاج میں تیزی اور بڑھ گئی تھی۔ سمینار کے بعد جب ہم ان سے رخصت ہو رہے تھے تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ ہم سے اپنی سخت کلامی پر معافی مانگ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی تمام کوتاہیوں کو معاف فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عنایت فرمائے۔

آمین!!

مولانا شہاب الدین ندوی

قارئین معارف کو اس اطلاع سے نہایت رنج ہوگا کہ ان کے محبوب اور معارف کے خاص مضمون نگار مولانا شہاب الدین ندوی ۱۹ اپریل ۲۰۰۲ء کو سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

وہ کئی برس سے موذی امراض میں مبتلا تھے اور چند ماہ سے موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار تھے جس کی تفصیل مجھے ۳۱ دسمبر ۲۰۰۱ء کو اپنے والانامہ میں اس طرح لکھی تھی۔

"طبیعت بہت زیادہ خراب اور نڈھال رہتی ہے، کئی کئی دن بستر پر پڑا رہتا ہوں علاج و معالجے سے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے، کئی قسم کے امراض میں مبتلا ہوں اور ڈاکٹر ان کی صحیح تشخیص نہیں کر پا رہے ہیں، ایک بیماری ذرا دبتی ہے تو دوسری ابھر کر سامنے آجاتی ہے، ان جان لیوا بیماریوں سے تنگ آچکا ہوں اور مزید طرفہ یہ کہ اب آنکھوں کی بینائی بھی مسلسل ضائع ہوتی جارہی ہے۔ داہنی آنکھ کا آپریشن ہوا مگر بینائی بڑھنے کے بجائے

گھٹ رہی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اب میں صرف چند دن کا مہمان ہوں، لیکن طبیعت جب کبھی ذرا سنبھلتی ہے تو جم کر لکھنے اور اپنے مسودات صاف کرنے بیٹھ جاتا ہوں۔"

آخر وہی ہوا، خط لکھنے کے ساڑھے تین مہینے بعد وقت موعود آگیا اور مولانا کی ساری دینی، علمی اور تحقیقی سرگرمیاں ہمیشہ کے لئے بند ہوگئیں۔

مولانا کا وطن بنگلور تھا۔ میٹرک کی تعلیم یہیں ہوئی اور دینی تعلیم کی تکمیل دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں کی۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے ان کی طبیعت کا رجحان قرآنی علوم اور سائنس کی جانب ہوگیا تھا اور وہ ان میں تطبیق اور ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتے تھے اسی لئے لکھنؤ کے بعض کالجوں کے سائنس کے اساتذہ سے ان کا ربط و ضبط ہوگیا تھا، دارالعلوم سے فراغت کے بعد وہ اپنے وطن واپس آئے تو دوسروں کے سہارے اور سرپرستی کے بغیر تنہا اپنے بل بوتے پر بڑی خاموشی مگر صبر و استقلال سے اپنی دنیا آپ تعمیر کرنے میں مصروف ہوگئے، جس کے لئے اپنی ساری دلچسپیاں اور لذتیں ترک کی، مجلس آرائی اور دوستوں کی صحبتوں کا لطف چھوڑا، جلسوں اور سمیناروں کی واہ واہ سے کان بند کئے، شادیوں اور جنازوں میں جانا بند کیا، تب جاکر انھوں نے علم و ہنر کے تازہ جوہر چمکائے، میری ان کی پہلی ملاقات ۱۹۷۵ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشن میں ہوئی تھی اس وقت میں نے ان کو جس حال میں دیکھا تھا، اس کے بعد ہی سے یہ خیال ہوگیا تھا کہ کسی عظیم و جلیل مقصد کے لئے بڑے ایثار و قربانی سے کام لینا پڑتا ہے، بڑی محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے، اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ کاٹنا پڑتا ہے، راتوں کی نیند حرام کرنی پڑتی ہے، دن کے ہنگاموں سے بے تعلق رہنا پڑتا ہے، شب و روز مطالعے میں غرق رہنا پڑتا ہے، پڑھنے لکھنے میں صحت اور آنکھوں کی بینائی کھوئی پڑتی ہے، مولانا کو یہ سب کچھ کرکے

ان کا گوہر مراد ہاتھ آیا تھا اور فرقانیہ اکیڈمی قائم ہوئی تھی جس سے ان کی کئی درجن کتابیں شایع ہوئیں جن کی منفرد نوعیت کی بنا پر اہل علم کو ان کا لوہا ماننا پڑا تھا۔

جل گیا خاک ہوا خاک بھی برباد ہوئی تب کہیں نام چلا عشق میں پروانے کا

مولانا میں بڑی انرجی اور غیر معمولی صلاحیت تھی، برابر مضامین نو کے انبار لگاتے رہتے تھے، وہ مجھ سے اس کے خواہش مند رہتے تھے کہ معارف کا کوئی شمارہ ان کے مضمون سے خالی نہ رہے، اگر کبھی ناغہ لمبا ہو جاتا تو شکایت کے خطوط آنے لگتے تھے، ان کو اس کی بڑی تکلیف تھی کہ ان کے مضامین اور کتابوں کا کوئی قدرداں نہیں، کوئی بھی بہ طور ہمت افزائی دو بول تک بولنے کا روادار نہیں۔ ان کے جس والا نامہ کا ذکر پہلے آیا تھا، اس میں بڑے کرب سے علماء کے بارے میں تحریر فرمایا تھا:

"مجھے سب سے زیادہ شکایت علماء سے ہے جو قرآنی حقائق و معارف کو اجاگر کرنے کے بجائے انہیں دبانے اور نوع انسانی کو اندھیرے میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں مدرسے چلانے کے لئے صرف چندے کی فکر رہتی ہے اور انہوں نے قرآنی تقاضوں کو پس پشت ڈال دیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ ایک تلخ حقیقت ہے جو خون کے آنسو رلانے والی ہے، آج اگر یہ امت متحرک ہوتی تو اس کی زبوں حالی کا یہ وقت کبھی نہ آتا، اسے ہماری ملت کا ایک المیہ نہ کہا جائے تو پھر کیا کہا جائے۔"

ان کی یہ شکایت بے جا نہیں تھی، گو قوم نے معارف میں چھپنے والے ان کے مضامین کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی تاہم ان کی تصنیفات کو قبولیت حاصل ہوئی اور وہ اہم اور باوقعت ضرور خیال کی گئیں، وہ خود اپنے اسی والا نامہ میں رقم طراز ہیں:

"ناچیز کی اردو، عربی اور انگریزی کتابیں مسلسل شائع ہو کر تقریباً ملک عالم

اسلام میں پہنچ چکی ہیں اور خاص کر پاکستان میں بغیر اجازت ایک ایک کتاب کو کئی کئی ناشرین نے بیک وقت شائع کیا ہے، کچھ نئی کتابیں بذریعہ رجسٹری ارسال خدمت کی جا رہی ہیں، آپ سے گزارش ہے کہ ان کتابوں پر خصوصی اور مفصل تبصرہ فرمائیں اور کسی کتاب پر باب التقریظ والانتقاد میں مفصل تعارف کرائیں، اگر آپ یہ تبصرہ خود فرمائیں تو زیادہ بہتر ہوگا، جس طرح کہ آنجناب نے تازہ معارف میں مولانا حمید الدین فراہی کی تفسیر سورۂ بقرہ پر فرمایا ہے۔"

مولانا اپنے مضامین و تصنیفات سے یہ بتانا چاہتے تھے کہ قرآن مجید جدید علوم اور سائنس و ٹکنالوجی کے خلاف نہیں ہے بلکہ ان سے قرآنی افکار و نظریات کی تائید و تصدیق ہوتی ہے، مغربی فکر و فلسفہ سے مسلمان مرعوب ہونے کے بجائے قرآن مجید کی تعلیم و ہدایت دنیا کے سامنے پیش کریں۔ ان کی نشاۃ ثانیہ اسی طرح ہو سکتی ہے کہ وہ اسلام پر کاربند رہ کر نئے علوم و فنون اور سائنس اور ٹکنالوجی کی تحصیل کریں تاکہ اسلام کی ابدی صداقت آشکارا ہو، مولانا قرآن مجید کی روشنی میں نیا فلسفہ و کلام اس لئے مرتب کرنا چاہتے تھے کہ معاندین و منکرین کے باطل نظریات اور ملحدانہ خیالات کا رد و ابطال کر سکیں۔ اسے وہ وقت کا ضروری اور مقدم کام سمجھتے تھے، ان کے نزدیک اس کے بغیر نہ نوع انسانی کی اصلاح و ہدایت کا کام انجام پا سکتا ہے اور نہ اس کو گمراہی و تاریکی سے نجات مل سکتی ہے جس کا مواخذہ مسلمانوں سے ہوگا جو خلق کی اصلاح و ہدایت پر مامور کئے گئے ہیں، ان کی تگ و دو کا حاصل یہ تھا کہ سائنس، ٹکنالوجی اور علوم جدیدہ کا رشتہ دین حق سے جوڑا جائے اور آفاق و انفس میں پنہاں دلائل قدرت کو آشکارا کر کے سائنس کو مسلمان بنا دیا جائے

مولانا کی چند تصنیفات کے نام یہ ہیں:

(۱) چاند کی تسخیر قرآن کی نظر میں (۲) قرآن اور نظام فطرت (۳) اسلام اور جدید سائنس (۴) اسلام کی نشاۃ ثانیہ قرآن کی نظر میں (۵) قرآن مجید اور دنیائے حیات (۶) تخلیق آدم اور نظریۂ ارتقاء (۷) جدید علم کلام قرآن اور سائنس کی روشنی میں (۸) قرآن حکیم اور علم نباتات (۹) اسلام اور جدید عالمی نظام (۱۰) اسلامی شریعت علم اور عقل کی میزان میں (۱۱) عورت اور اسلام (۱۲) اسلام کا قانون نکاح (۱۳) اسلام کا قانون طلاق (۱۴) تعدد ازدواج پر ایک نظر (۱۵) جینز ایک غیر اسلامی تصور وغیرہ۔

مولانا کی اکثر کتابوں کے عربی اور انگریزی میں ترجمے بھی ہوئے ہیں۔

مولانا شہاب الدین صاحب نے ۱۹۷۰ء میں فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ قائم کی جو اسلامی علوم، فلسفہ وکلام، جدید علوم و فنون اور جدید مسائل و موضوعات کی کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہے۔ جنوبی ہند میں تن تنہا اتنا بڑا علمی و تحقیقی مرکز اور عظیم الشان کتب خانہ قائم کر دینا ان کا بڑا کارنامہ ہے، اس سے ان کے پُرخلوص جذبے، پختہ عزم وارادے اور سچی اور پکی دھن کا اندازہ ہوتا ہے۔ اب یہ اکیڈمی ترقی کے جو مراحل طے کر چکی ہے، اس کا حال خود مولانا نے اپنے محولہ گرامی نامہ میں یہ بیان کیا ہے:

"آج کل فرقانیہ اکیڈمی ترقی کے منازل طے کر رہی ہے، الحمد للہ اکیڈمی کی نئی عالی شان سہ منزلہ عمارت ابھی ابھی بن کر تیار ہو گئی ہے اور اس میں اکیڈمی کی عظیم الشان لائبریری منتقل کی جا چکی ہے جو لگ بھگ چالیس ہزار مراجع کی کتابوں پر مشتمل ہے اور اس گلشن کو پچھلے ۴۰-۵۰ سال عرصے میں اپنے خون جگر سے سینچ کر اسے فروغ دیا ہے اس نئی عمارت کا افتتاح عنقریب ہونے والا ہے، انشاء اللہ اس تقریب کے موقع پر آنجناب کو بھی مدعو کیا جائے گا۔"

افسوس ہے کہ ان کا یہ ارمان پورا نہیں ہوا اور ان کی زندگی میں اکیڈمی کی نئی عمارت کا افتتاح نہیں ہو سکا۔

ایک زمانے میں انہوں نے فرقانیہ اکیڈمی سے "تعمیر ملت" کے نام سے ایک رسالہ بھی نکالا تھا جس کو ناقدری کی بنا پر بند کرنا پڑا۔

مولانا دراصل سلف میڈ تھے، انہوں نے اپنی ہمت، جفاکشی اور کد و محنت سے گوناگوں عظیم الشان کام انجام دئے۔ ان کے صاحبزادگان کو جو فارغ التحصیل ہیں، اس علمی میراث پدر کے تحفظ و بقا اور مزید فروغ و ترقی کا سامان کرنا چاہئے، خدائے تعالیٰ ان کو جنت الفردوس نصیب کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین

"ض"

جناب صہبا لکھنوی

صہبا لکھنوی مدت سے بیمار تھے، وہ خلقتاً بھی نحیف اور کمزور تھے اس کے باوجود افکار کی ترتیب وادارت اور اس سے متعلق کاموں کی نگرانی کرتے تھے، بالآخر ۳۰ مارچ ۲۰۰۲ء میں پیام اجل آگیا، مرحوم افکار کے بانی مدیر تھے اور صحافیوں کی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جو صلہ وستائش سے بے پروا ہو کر ادب پروری اور صحافت وادب کے فروغ کے لئے صحافت کے پیشے سے وابستہ ہوتی تھی۔

صہبا صاحب کا اصل نام سید شرافت علی تھا، ان کا آبائی وطن لکھنؤ تھا، مگر وہ ۲۵ دسمبر ۱۹۱۹ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے تھے، تقسیم سے پہلے بمبئی رہائش پذیر تھے اور ۱۹۴۵ء میں بمبئی سے ماہنامہ افکار جاری کیا اور اپنی ساری قوت و توانائی اسی میں لگا دی، ان میں شعر وادب اور نقد و نظر کی جو صلاحیتیں اور قابلیتیں پنہاں تھیں ان کو افکار کے لئے قربان کر دیا اور اپنے نوک خامہ سے دوسرے ارباب قلم کی تحریریں چمکاتے

اور افکار میں شایع کرکے ان کی ہمت و حوصلہ بڑھاتے اور ان کی عزت افزائی کرتے، انھوں نے بڑے بڑے ادیبوں کی تحریروں کے معاملے میں اپنا حق ادارت محفوظ رکھا اور ان کی کوئی رو رعایت نہیں کی۔

تقسیم کے بعد کراچی آئے تو افکار نے یہاں سے دوسرا جنم لیا، صہبا صاحب مالی مشکلات اور دوسری پریشانیوں سے دوچار ہوئے اور لوگوں کی نکتہ چینی کا نشانہ بنے مگر افکار کی خدمت و ترقی میں ہمہ تن منہمک رہے، رات دن، اٹھتے بیٹھتے اور چلتے پھرتے افکار ہی ان کے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا، ان کے پاس زیادہ سرمایہ نہ تھا لیکن جو کچھ اور جس قدر تھا سب افکار کی نذر کر دیا، اپنے بعد بھی اس کو جاری رکھنے کے لئے افکار فاؤنڈیشن قائم کیا، وہ اور افکار لازم ملزوم تھے، انھوں نے اس کا دائرہ بہت وسیع کر دیا، ہر جگہ کے لکھنے والوں نے ان کا تعاون کیا، اب برصغیر ہی نہیں بیرونی ملکوں میں بھی اردو کی نئی بستیاں ہوگئی ہیں، اور ان میں اردو کے مرکز قائم ہو رہے ہیں، ان سب جگہوں کے ممتاز اہل قلم افکار کی محفل میں شریک رہتے ہیں، اس طرح افکار کا تعلق پوری ادبی دنیا سے تھا اور وہ مختلف خطوں کے ادب کو روشناس اور ہر جگہ کے ادیبوں کے رابطے کا کام کر رہا تھا، وہ قید مقام سے آزاد اور ادبی معیار و اقدار کو برقرار رکھ کر وسیع المشربی، انسان دوستی اور بے تعصبی کا درس دیتا تھا، صہبا صاحب کا یہ کمال تھا کہ نصف صدی سے زیادہ عرصے تک ایک ادبی رسالے کو پابندی وقت سے نکالتے رہے اپنی ذہنی جدت و اختراع کی بنا پر زندہ ادیبوں اور شاعروں پر افکار کے متعدد خصوصی نمبر نکالے اور اس میں بہت سے ادبی سلسلے شروع کئے، ادبی و تہذیبی رجحانات پر مباحثوں کا آغاز کیا، سمیناروں اور رپورتاژوں کا سلسلہ چلایا، مقتدر ادبی شخصیتوں کی آپ بیتی اور ممتاز ادیبوں کے اشاریے کی روایت قائم کی، زندہ اور تازہ

ادب کو فروغ دے کر افکار کو شہرت و اعتبار بخشا۔ اسی بنا پر انہیں عہد ساز مدیروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

افکار کے عشق نے ان کو صرف اسی کی زلف کا اسیر بنا دیا تھا اور ان کا سارا وقت اسی کو بنانے اور سنوارنے میں گزرتا تھا، اس ادھیڑ بن میں ان کو خود کچھ کہنے اور لکھنے کا موقع نہیں ملتا تھا، مجاز مرحوم کہتے تھے "صہبا نے اوروں کے گریبان سی ڈالے مگر اپنا گریبان بھول گئے" لیکن خود افکار کا ہر شمارہ بھی تو ان کی ایک تصنیف ہوتا تھا انہوں نے اس کے جو خاص نمبر نکالے اور جو اردو کی ادبی تاریخ کا قیمتی اثاثہ بنے وہ مستقل تصانیف سے بڑھ کر ہیں، اس طرح دوسروں کا گریبان رفو کرنا اپنا ہی گریبان سینا تھا، بقول اصغر؎

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا

گو افکار کے اجرا کے بعد وہ ادب نواز، ادیب گر اور مبصر بن گئے تھے اور دوسروں کے فکر و فن کو فروغ دینے کے لئے اپنے وجود اور بظاہر اپنی ادبی ہستی کو مٹا دیا تھا جو ان کا زبردست ایثار اور قربانی ہے تاہم ادبی افق پر وہ ایک ادیب و شاعر کی حیثیت سے نمودار ہوئے تھے، ان کا پہلا شعری مجموعہ "ماہ پارے" بھوپال سے شائع ہوا تھا اور دوسرا مجموعہ اس کے بعد "زخم کے" کے نام سے چھپا۔ "میرے خوابوں کی سرزمین" ان کا سفر نامہ ہے، اقبال اور بھوپال" تحقیقی کتاب ہے، "منٹو ایک کتاب" "مجاز ایک آہنگ" اور "رئیس امروہوی فن اور شخصیت" بھی ان کی تصانیف ہیں۔

صہبا صاحب اردو کی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے، اسے فعال تنظیم بنانے میں انہوں نے عملاً حصہ لیا اور افکار کے ذریعہ ترقی پسند خیالات کی اشاعت کی، عقیدہ و

مذہب کے اختلافات سے تعرض کئے بغیر زندگی کے حقائق و تجربات اور تہذیبی و معاشرتی مسائل کو ادب میں جگہ دی، انجمن ترقی پسند مصنفین کی روداد اور تحریک کی سرگرمیوں سے متعلق چیزوں کا افکار میں ذکر کرتے۔

خوش خلق اور باوقار انسان تھے، اخلاق، وضع داری، خاکساری، ملنساری اور مستقل مزاجی ان کی سیرت کا خاص جوہر تھا، انتظامی، مالی اور دوسری طرح کی شدید مشکلات کے باوجود افکار کو نصف صدی سے زیادہ عرصے تک جاری رکھنا ان کے عزم و استقامت اور قوتِ خودارادی کی مثال ہے، اسے محنت اور لگن سے مرتب کرکے پابندی وقت سے شائع کرنا اپنا ادبی و اخلاقی فریضہ سمجھتے تھے۔ صلح کل پر عمل پیرا تھے، خورد نواز تھے، کسی کی دل شکنی اور ہمت شکنی نہ کرتے لیکن اصولوں اور افکار کی پالیسی کے بارے میں کوئی سمجھوتا نہیں کرتے تھے اور اس میں بڑی بے باکی اور صاف گوئی سے کام لیتے تھے، جوڑ توڑ سے کام لینے کے بجائے ہمیشہ خلوص اور لگن سے کام کرتے تھے اور کسی صلہ و ستایش کی توقع نہ رکھتے، وہ ارادے اور دھن کے پکے تھے، جس کام کی ٹھان لیتے اسے کرکے ہی دم لیتے۔

دین دار اور سادگی پسند تھے، نماز کے پابند تھے، قرآنِ مجید کی تلاوت ان کے معمول میں داخل تھی، اسلامی شعار و اقدار کو عزیز رکھتے تھے، مولانا حسرت موہانی کی طرح ان کی ترقی پسندی ان کے اچھا مسلمان ہونے میں مانع نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ علم و ادب کے اس شیدائی کی مغفرت فرمائے۔ آمین!!

ڈاکٹر ابو محمد سحر

ڈاکٹر ابو محمد سحر ۲۹؍ اپریل ۲۰۰۲ء کو شب میں بھوپال میں انتقال کر گئے، دوسرے دن صبح سیفیہ کالج بھوپال سے ملحق قبرستان میں تدفین ہوئی، وہ اردو کے مشہور ادیب و شاعر تھے،

انہوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کیا اور آگرہ یونیورسٹی سے امیر مینائی پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ بعد میں یہی مقالہ ترمیم و اضافے کے بعد "مطالعۂ امیر" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔

مرحوم سحر صاحب کو اردو شاعری کی صنف قصیدہ نگاری سے بڑی دلچسپی تھی ان کی سب سے پہلی کتاب اسی موضوع پر اردو میں قصیدہ نگاری کے نام سے ۱۹۵۸ء میں چھپی، یہ مختصر ہونے کے باوجود موضوع کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے، اس میں قصیدہ سے متعلق بڑی محنت و تحقیق سے مفید و مستند معلومات جمع کئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی دلچسپی کا ایک موضوع غالبیات بھی تھا، زبان و لغت و املا اور اس کی اصلاح کے متعلق بھی تحریری نقوش چھوڑے ہیں، اردو میں قصیدہ نگاری اور مطالعہ امیر کے علاوہ ان کی یہ یادگاریں بھی ہیں، تنقید و تجزیہ، انتخاب قصائدِ اردو مع مقدمہ و حواشی، غالبیات کے چند مباحث، اردو املا اور اس کی اصلاح، زبان اور لغت۔

شاعری کی جانب جناب سحر کا طبعی میلان تھا۔ اسی راہ سے وہ ادب کے میدان میں داخل ہوئے تھے، ان کی شاعری کا آغاز نظم نگاری سے ہوا، پھر غزلیں، قطعات اور رباعیاں بھی کہیں، ابتدائی کلام محفوظ نہیں رکھا۔ آخر میں شعر کہنے کی رفتار سست ہوگئی تھی تاہم شعر کہنے کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا اور "برگِ مژگاں" کے نام سے شعری مجموعہ بھی چھپا۔

ابو محمد سحر کم آمیز، کم سخن، سنجیدہ اور باوقار شخص تھے، شورش و ہنگامے سے دور رہتے تھے گوشہ نشینی پسند کرتے تھے شہرت اور نام و نمود سے دلچسپی نہ تھی، اس کے اور اعزاز و انعام کے لئے نہ پریشان ہوتے اور نہ بھاگ دوڑ کرتے، ان کی دنیا اپنے حلقے تک محدود تھی، درس و تدریس کے علاوہ اپنے گوشے میں بیٹھ کر علمی و ادبی کام انجام دیتے، اللہ تعالیٰ عالمِ آخرت میں ان کے درجات بلند کرے، آمین!

ادبیات

عربی نعت

از مولانا محمد سعید مجددی رکن مجلس انتظامی دار المصنفین*

یفوح الھواء بعطر فرید بذکر الحبیب المطاع المجید

ہوا ایک بے مثل عطر سے مہک رہی ہے، حبیب پاک ﷺ کے ذکر کی وجہ سے جو اطاعت کئے ہوئے ہیں، بزرگی والے ہیں۔

نبی کریم رسول الوریٰ بعلم و نور و حکم اتیٰ

جو نبی کریم ہیں تمام مخلوق کے لئے رسول ہیں، جو علم، نور اور اقتدار لے کر آئے ہیں۔

ھدی الناس حقا سواء السبیل بوحی العلی الحکیم الجلیل

بلاشبہ انہوں نے لوگوں کو سیدھا راستہ بتلایا، وحی کے ذریعہ سے جو بلند حکمت والی عظیم الشان ذات کی طرف سے ان پر آئی۔

بفضل من اللہ نال الکتاب ففیہ النجاۃ و فیہ الصواب

اللہ تعالیٰ کے فضل سے انہوں نے کتاب پائی، اب اسی میں نجات کا راستہ ہے اور اسی میں درست باتیں ہیں۔

تعالوا الی المجد یا عاقلون تأسوا بذی النور یا قائدون

اے عقلمندو! عزت اور بلندی کی طرف آؤ، اے رہنمائی کرنے والو! صاحب نور کی پیروی کرو۔

ھو النور احمد علا قدرہ و فی کل سفر اتی ذکرہ

---

* خانقاہ شریف مجددیہ۔ ادارہ تعلیم و تربیت و اصلاح، پیر گیٹ بھوپال۔

وہ نور احمد ہیں جن کا مرتبہ بلند ہے، اور ہر آسمانی کتاب میں ان کا ذکر موجود ہے۔

بحسن و خلق بدا وصفہ بصدق وجود ذکا عرفہ

حسنِ صورت اور حسنِ سیرت کے ساتھ ان کا وصف ظاہر ہوا، سچائی اور سخاوت کے ساتھ دنیا میں ان کی خوشبو مہکی۔

لقد کان فی الارض سوء النظام وساد العقول سواد الظلام

دنیا میں بد نظمی پھیلی ہوئی تھی، اور عقلوں پر ظلمتوں کی سیاہی چھائی ہوئی تھی۔

فجاءَ بفوز رحیب الجہات بفوز الحیاۃ و فوز الممات

اس حالت میں وہ ایسی کامیابی لے کر تشریف لائے جس کے گوشے وسیع ہیں، یعنی حیاتِ دنیا کی کامیابی بھی اور وفات کی کامیابی بھی۔

اضاء الطریق لکل البشر طریقا سویا لنیل الظفر

انہوں نے ہر انسان کے لئے راستہ روشن فرمایا، ایسا راستہ جو کامیابی حاصل کرنے کے لئے بالکل سیدھا اور سچا ہے۔

طریقا قرینا بحسن النظام وعھدا وثیقا لحسن الختام

ایسا طریقہ دیا جو نظامِ زندگی کی خوبی کا حامل ہے اور ایسی دستاویز دی جو حسنِ خاتمہ کی ضامن ہے۔

یسیرا جدیرا بکل الزمن خلیقا واھلا لکل الوطن

اس طریقہ پر عمل پیرا ہونا آسان بھی ہے اور وہ ہر زمانہ کے لئے مناسب بھی ہے نیز وہ ہر ملک و وطن کے لئے قابل قبول بھی ہے۔

فلا علم الا بعلم الکتاب ولا فوز الا بفوز الحساب

بس اب کوئی علم کتابِ الٰہی کے علم کی موافقت کے بغیر قابلِ قبول اور صحیح نہیں ہے، اور کوئی کامیابی حقیقت

میں کامیابی نہیں ہے جب تک کہ وہ روزِ حساب کی کامیابی سے وابستہ نہ ہو۔

فیارب بلغه منا السلام وصل علیه دوام الدوام

پس اے پروردگار اس ذاتِ اقدس کی خدمت میں ہمارا سلام پہنچا دیجیے۔ اور ہمیشہ ہمیشہ ان پر اپنی رحمت اور درود نازل فرمائیے۔

اتاك سعید غلام الغلام بعذر ومدح رسول الانام

اے تمام مخلوق کے رسول یہ سعید جو آپ کے غلاموں کا غلام ہے، اپنی تقصیرات کے عذر کے ساتھ آپ کی مدح میں یہ نظم لے کر حاضرِ خدمت ہوا ہے۔

نعت

از ڈاکٹر رئیس نعمانی ٭

جب بھی مدینہ یاد آ جائے ‌ ‌ دل تڑپے اور آنکھ بھر آئے

دنیا ہاتھ آئے کہ نہ آئے ‌ ‌ آپ کی الفت دل سے نہ جائے

قابلِ رشک ہیں آنکھیں ان کی ‌ ‌ جو دربارِ نبیؐ دیکھ آئے

کعبہ اور مدینہ دونوں ‌ ‌ مجھ کو بھی اللہ دکھائے

آپؐ کے پیرو اپنی جگہ ہیں ‌ ‌ دھوپ تپے یا بادل چھائے

امن و سکوں گر چاہے دنیا ‌ ‌ آپؐ کا طرزِ حیات اپنائے

آپؐ کے فرماں برداروں کو ‌ ‌ کوئی اب اتنا بھی نہ ستائے

ڈرے خدا کے قہر سے دنیا ‌ ‌ وقت ہے اب بھی ہوش میں آئے

بیت رہی ہے جو کچھ دل پر ‌ ‌ کیسے وہ لفظوں میں سمائے

میں ہوں رئیس اور ہند کا زنداں
دنیا مدینہ جائے، آئے

٭ ہاؤس نمبر ۱۱۰/۳۰، اے لوکو کالونی (نئی آبادی)، علی گڑھ۔

مطبوعات جدیدہ

مجموعہ قوانین اسلامی مرتبہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، تقطیع متوسط سے قدرے بڑی، کاغذ و طباعت بہتر، مجلد، صفحات ۷۰۹، قیمت ۱۴۰ روپے، پتہ: آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ 76 A/1، اوکھلا مین مارکیٹ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

ہندوستانی قانون کے سول کوڈ کے عموم سے بعض شخصی و مذہبی قوانین کو خاص اور مستثنیٰ اس لئے کیا گیا کہ ان پر اپنے اپنے مذہب کے مطابق عمل کیا جا سکے، نکاح و طلاق، رضاعت و حضانت و ولایت، وراثت و وصیت اور ہبہ و وقف اور ان کے متعلقات پر مشتمل شریعت کے احکام کی تعمیل و تنفیذ کا حق و اختیار بھی مسلم پرسنل لا کے نام سے دیا گیا، لیکن سیاسی مفاد و مصلحت بلکہ جبر کے تحت اس جزوی اختیار کو بھی سلب کر لینے اور یکساں سول کوڈ کو نافذ کرنے کا مطالبہ اکثریت کے ایک طبقہ کی جانب سے شروع ہوا اور یہ شدید تر ہوتا گیا، قدرتاً علماء و فقہاء و زعمائے ملت نے قرآن و حدیث پر مبنی ان قوانین اسلامی کی قانونی تنسیخ کو شریعت میں مداخلت اور اس پر عمل کے آئینی حق سے جبری محرومی پر محمول کیا، اس سلسلے میں جن ضروری پیش بندیوں پر توجہ کی گئی، ان میں قانونِ ہند کے مسلم پرسنل لا کی صحیح و مستند تعریف و ترجمانی اور ملکی عدالتوں کی غرض سے متعلقہ شخصی و مذہبی قوانین کے جامع [illegible] دفعہ وار مجموعے کی ترتیب بھی تھی، مسلم پرسنل لا بورڈ کے سابق صدر مولانا منت اللہ رحمانی مرحوم نے ممتاز فقیہ علماء کی ایک جماعت کے تعاون سے اس مہتم بالشان کام کی ابتدا و تکمیل کی، اس میں دفعہ وار ترتیب، حواشی، تشریح، اصل عبارتیں اور حوالہ جات کا

اہتمام کیا گیا، الفاظ و عبارات کے انتخاب و استعمال میں قانونی زبان کی نزاکت کو بھی ہوش مندی سے ملحوظ رکھا گیا جس کا اندازہ خاص طور پر ولایت، نکاح، کفارت، طلاق، وقوع طلاق اور مفقود الخبر شوہر جیسے مسائل سے ہوتا ہے، سینکڑوں دفعات میں چند ہی سے بعض طبقوں کو اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن عام لفظی اختلاف اور ہندوستان کے موجودہ پرسنل کی دفعات کے عمل میں جو نازک فرق ہے، وسعت نظر سے دیکھنے پر اس مجموعہ کی جامعیت و افادیت سے انکار مشکل ہے، اس نہایت ضروری فریضے کے لیے امت مسلم پرسنل لا بورڈ خصوصاً مولانا منت اللہ رحمانی کی مرہون منت ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی و قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمہا اللہ کے مقدمہ و پیش لفظ سے اس مجموعے کی ضرورت و اہمیت کی بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے۔

بنو ہاشم اور بنو امیہ کے معاشرتی تعلقات از پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۱۷۲، قیمت ۱۱۰ روپے

پتہ: ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

بنو ہاشم و بنو امیہ کی داستان دنیا کے دو معزز ترین خاندانوں کی ایسی تاریخ ہے جس میں صاحب نظر محقق کے لیے تاریخ کی جملہ دلچسپیوں کا سامان ہے، بدقسمتی سے اس کا سیاسی رنگ اس درجہ غالب رہا کہ گویا اسلام سے پہلے اور بعد، ان دونوں کی تاریخ صرف نفرت و عداوت، باہمی رقابت، تعصب اور اقتدار پر تسلط کی تفصیل ہو گئی۔ اس کتاب کے فاضل مصنف نے اس رویہ کو تاریخ اسلام کے مسخ کیے جانے کی شعوری کوشش گردانتے ہوئے مذموم آمائی کے اساطیری قصوں سے جدا ایک سچی حکایت مہر و وفا مرتب کرنے کی مبارک سعی کی اور ان خاندانوں کے معاشرتی تعلقات پر توجہ مرکوز

کر کے حزم و احتیاط لیکن انصاف سے اس سوال کا جواب تلاش کیا کہ آیا ان دونوں قبائل کی روش صرف حریفانہ ہی تھی یا برادرانہ بھی؟ اس کے لیے انہوں نے زمانہ جاہلیت، عہد نبوت، دور خلافت راشدہ اور خود عصر خلافت بنی امیہ میں بالترتیب بالتفصیل ان معاشرتی تعلقات کی جستجو کی جن کے متعلق گلہ ہے کہ مورخین نے عموماً چشم پوشی کی، خلیفہ ثالثؓ کا دور خلافت خاص طور سے نزاکتوں کا حامل ہے، اس کے جائزے میں ثابت کیا گیا کہ اس دور میں برادرانہ تعلقات قائم بلکہ مستحکم تر تھے، یہی حال خلافت علوی و اموی میں رہا، حتی کہ "سانحہ کربلا کی تہ میں اموی و ہاشمی عداوت کا کوئی جذبہ کارفرما نہیں تھا، اگر کوئی محرک تھا تو وہ استحقاق خلافت کا شاخسانہ تھا" چونکہ سیاسی تعلقات اصل موضوع نہیں، اس لیے فاضل مصنف بعض سخت مقامات سے بآسانی گزر گئے، تاہم موضوع کے تعلق سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہیں، جدید و منفرد ہونے کی وجہ سے بحث میں لذت و حلاوت ہے، دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس میں بصیرت و افادیت کے نئے گوشے بھی ہیں۔

مجنوں گورکھپوری، حیات اور ادبی خدمات از ڈاکٹر شاہین فردوس متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۸۲، قیمت ۲۵۰ روپے

پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔

معلم و محقق، ادیب و ناقد، افسانہ نگار و شاعر اور صحافی و مترجم کی حیثیت سے مرحوم مجنوں گورکھپوری کا شمار اردو کے ممتاز اہل قلم میں ہوتا ہے، خصوصاً ان کی تنقید و افسانوں کا بڑا شہرہ رہا، ادب و زندگی، دوش و فردا، تاریخ جمالیات، غالب شخص اور شاعر اور شوپنہاور وغیرہ جیسی عمدہ کتابیں ان کی یادگار ہیں، لیکن ایسے مرتبہ بلند پر فائز ادیب و

نقاد کی جانب کم اعتنا کیا گیا تھا، مصنف نے مجنوں صاحب کو اپنے تحقیقی مقالے کا موضوع بنا کر ان کی شخصیت کے منتشر اجزا کو یکجا کرنے کی لائق ستائش کوشش کی گو مقالہ محنت سے لکھا گیا ہے تاہم چند باتیں مزید توجہ طلب ہیں مثلاً مکتوب نگاری کی معروف تعریف میں پردیسی کے خطوط کو اس اعتراف کے باوجود شامل کرنا محل نظر ہے کہ "یہ فرضی مکتوب الیہم کے نام ہیں اور ان میں علمی و تنقیدی مسائل پر بحث ہے"۔ زبان و بیان پر بھی توجہ کی ضرورت تھی "ساری زندگی پراگندہ روزگار میں گزری، سرتاسر درد کا مرکب، پلاٹینیم جوبلی منایا جائے، اکیڈمی کی استقامت (قیام؟) کا مقصد، پوشاک پرتکلف مگر سادہ، آم پسند نہیں فرماتے تھے، بغیر کی بجائے بنا کا لفظ گراں گزرتا ہے ایک ہی جملہ میں باحوصلہ، پرامید اور ہشاش بشاش کے اوصاف شمار کرنے کے بعد ذیل میں عبارت ایسی جو بقول مصنف انتہائی یاس و حرماں کی آواز ہے کچھ لوگوں کا کہنا تھا، اس قسم کے جملے تحقیقی مقالے میں اچھے نہیں، وضاحت یا اشارہ ضروری ہے غبار خاطر میں صدیق مکرم کے طرز تخاطب کو صدیق صاحب سے تعبیر کرنا تو صریح فاش اور افسوس ناک غلطی ہے کتابت کی غلطیاں کثرت سے ہیں، آیندہ اڈیشن میں ان کی تصحیح ضروری ہے۔

لمحات نبویؐ از جناب مولانا محمد الیاس بھٹکلی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۰۴، قیمت ۵۰ روپے پتہ: دار العلم، ۳۱۔ محمد علی روڈ، بھٹکل کرناٹک۔

سیرت طیبہ کے موضوع پر ہونہار اور لائق مصنف کی یہ کتاب اس لحاظ سے جدا شان رکھتی ہے کہ اس میں رسول اکرمؐ کے شب و روز کے معمولات و مشاغل ایک روزنامچہ کے اسلوب میں پیش کیے گئے ہیں۔ گویا حیات مبارکہ کی متحرک تصویر سامنے ہو، اس تالیف کا مقصد بھی یہی ہے کہ روزانہ کے عام معمولات میں ایک انسان کے لیے اسوۂ نبوی کا ایسا عملی نمونہ جس میں موکدات سنت کا ذکر خاص طور پر ہو پیش کیا جائے۔ اس کے لیے صحاح ستہ کے حوالوں سے ماثور و مسنون دعاؤں کو نقل کر کے اصل محل پر خوبصورتی سے بیان کر دیا گیا ہے، اس سے کتاب کی افادیت اور بڑھ گئی ہے۔ ع۔ ص۔